خوں بہا

حصہ اول

حکیم احمد شجاع

فیروز سنز

پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

لاہور	کراچی	پشاور	لندن این ۴
دی مال	میکلوڈ روڈ	۳۵ دی مال	۲۷ بلیک اسٹاک روڈ

خوں بہا

حکیم احمد شجاع

فیروز سنز
پرنٹرز، پبلشرز، بُک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز
لاہور — کراچی — پشاور
۶۰- دی مال — میکلوڈ روڈ — ۳۵- دی مال
باردوم — سنہ ۱۹۵۱ء — قیمت چار روپے

بارِ دوم

تعدادِ اشاعت دو ہزار

قیمت چار روپے

۱۹۵۰ء

ناشران

خوں بہا

(افکارِ نظم و نثر)

از

حکیم احمد شجاع

معذرت

بہائے خونِ دلِ سادہ این دو سہ ورق است
چہ رنجہا کہ باین کار سالہا خوردم
ازاں کہ جنسِ فرومایہ درخورِ نظر است
عیارِ این زرِ نایاب را فرو بُردم

احمد شجاع

انتساب

مُشاہدات اور تصوّرات کی یہ دُنیا

جسے

پچاس برس کی محنت سے بسایا ہے

ایک قیمتی وراثت ہے

میں اِسے اپنے پہلے اور آخری شاگرد

سردار سر محمّد نواز خاں سردار آف کوٹ

اور اپنے بچّوں

ڈیزی دِل آرا، خورشید جہاں آرا اور انور کمال پاشا

کے محبُوب نام سے منسوب کرتا ہوں

کہ

یہ حق اُنہیں کو پہنچتا ہے

احمد شجاع

تفصیل

تعارف

نوائے کہ محوِ سخن گستران پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانہ تست

(غالبؔ)

شاعری نہ میرا پیشہ ہے، نہ عادت۔ قسّامِ ازل کی فیاضی سے طبیعت حسّاس اور موزوں ضرور پائی ہے۔ جب کبھی کسی نازک جذبے کو محسوس کرتا ہوں یا کوئی عجیب حقیقت دیکھتا ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں پھر اُس پر فکر کرتا ہوں اور اگر کوئی بات سمجھ میں آجائے تو اُسے مناسب الفاظ میں لکھ دیتا ہوں، کبھی یہ اظہار نثر کی چھوٹی سی عبارت میں ہو جاتا ہے، کبھی نظم کے ذرا سے ٹکڑے میں۔ یہ دونوں چیزیں میرے نزدیک شعر ہیں۔

مجھے اِس بات کا بھی دعوےٰ نہیں۔ کہ جن جذبات اور حقائق پر میں نے اظہارِ خیال کیا ہے اُن پر مجھ سے پہلے کسی اور نے اظہارِ خیال نہیں کیا۔ یا اُن کے متعلق جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں۔ اُس پر مجھ سے پہلے کوئی نہیں پہنچا میں صرف

اتنا جانتا ہوں کہ میرے لئے یہ تاثرات نئے ہیں اور اُن کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے وُہ میرے اپنے تخیّل کا ثمر اور میری اپنی فکر کا ماحصل ہے۔

میں نظم اور نثر کی کسی خاص صنف کا ماہر بھی نہیں اور زبان اور محاورے کے بارے میں میرا کلام کوئی سند بھی نہیں۔ تاہم جو کچھ لکھتا ہوں اور نظم اور نثر کی جس صنف میں لکھتا ہوں اُس کے اہتمام میں جہاں تک ہو سکتا ہے اُس کے امتیازات کو ملحوظ رکھتا ہوں۔ محاورے کی تحقیق اور صنائع ادب کی پابندی بڑی کاوش اور کوشش سے کرتا ہوں اور تخیّل کی جولانیوں کو اساتذہ کی مقرر کی ہوئی قیود سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ پھر بھی اگر میرے کلام میں کہیں کوئی غیر مانوس یا غیر معروف چیز نظر آجائے تو اُس کا سبب اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کبھی کبھی شاعر باوصفِ احتیاط اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور اُس کی فکر شدّتِ احساس سے مجبور ہو کر اُن زنجیروں کو توڑ دیتی ہے۔ جو پُرانی رسموں اور مستند تمیزوں نے اُس کے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں۔

تیس پینتیس برس میں جو کچھ لکھ سکا ہوں۔ اُس کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے آئیگا۔ یہاں صرف اِتنا ہی بیان کر دینا کافی ہے۔ کہ میری نظم و نثر کے اشعار کا وہ مجموعہ جو اس کتاب کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ ایک قسم کی ڈائری ہے۔ جس میں واقعات اور حالات کی جگہ ذہنی کیفیات اور نفسیاتی تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور جس میں ترتیب اور تدوین کا کوئی التزام نہیں۔ لیکن

اتنا ضرور ہے کہ اِس کی ہر چیز اس لحاظ سے بجائے خود مکمل ہے کہ میں اُس کی ذیل میں اِس سے زیادہ اور کچھ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ حمد، نعت، مدح، منقبت، مرثیہ غزل، قطعہ، رباعی غرض جو کچھ اِس کتاب میں ہے۔ میں نے اُس میں وہی اور اتنی ہی بات رکھی ہے جو مجھے شعر نظر آئی اور جس کے اظہار کو میں نے شعر سمجھا۔ خواہ مخواہ کی طوالت اور سخن سرائی نہ میری شاعری کا مقصود ہے نہ میرے اشعار میں اسے تلاش کرنا چاہیئے۔ میرے احباب نے جب کبھی نظم و نثر کے یہ بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھے، یا میرے اشعار سُنے اُن کی قدر کی۔ اور اب اُنہیں کی قدر افزائی اِس کتاب کی طباعت اور اشاعت پر مصر ہے۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ اِس کتاب کے مختلف حصّوں کو اصنافِ ادب کے لحاظ سے جداگانہ منقسم کر کے شائع کیا جائے۔ مگر میں نے اِسے ناحق کا تکلّف سمجھا۔ اور یہی بات پسند کی۔ کہ یہ تمام پریشاں افکار ایک ہی شیرازے میں بہم ہو جائیں۔

چونکہ میں نے اِس مجموعے کو ایک ڈائری سے تعبیر کیا ہے اِس لیئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بہت اِجمال کے ساتھ وہ حالات اور واقعات بیان کر دوں۔ جن کی سیلِ رواں کے ساتھ ساتھ میں اپنی عمر کے گزرے ہوئے زمانے میں بہتا چلا آیا ہوں اِن حالات کے بیان سے یہ مقصود نہیں کہ میں کسی ذاتی اہمیّت یا شخصی فوقیّت کے اظہار کے لئے بہانہ تلاش کروں۔ مدعا فقط یہ ہے کہ اس سلسلے میں اُن نامور بزرگوں کا بھی ذکر ہو جائے جن کے فیضِ صحبت سے ذلی مناسبت کو اکتسابِ دانش

کی سعادت میسّر آئی۔

پچھلے پچاس برس کی یہ سرگزشت اِس لحاظ سے ایک قیمتی یادداشت ہے کہ اِس میں ضمناً ان لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ ہے جن کے کارناموں کی درخشانی سے اس ملک کی قومی، مجلسی اور سیاسی تاریخ کے اوراق منوّر ہیں اور اس میں تلمیحاً ایسے حالات اور واقعات قلمبند ہو گئے ہیں جن کے اثرات ہمارے وطن کی عظمت کے امتیازی نقش و نگار اور ہماری پرانی تہذیب کے دلکش خط و خال ہیں۔ نقادانِ ادب کی رائے میں یہ روئداد اسلوبِ نگارش اور اندازِ بیان کے اعتبار سے مستقل ادبی اور تاریخی وقعت رکھتی ہے۔ اسی لئے میں نے مشاہدات اور تاثرات کے اس باب کو بھی اپنی زندگی کا ایک شعر سمجھ کر ایک مستقل عنوان کے تحت اِس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

احمد شجاع

تاثرات

خیر البشرؐ

اے رسُولِ ہاشمی اے سرِّ تکوینِ حیات
اے کہ تیری ذات ہے وجہِ نمودِ کائنات
تُو نہ تھا تو محفلِ کون و مکاں بے رنگ تھی
تُو نہ تھا تو بزمِ ہستی سازِ بے آہنگ تھی
حُسنِ فطرت میں ابھی ذوقِ خود آرائی نہ تھا
عشق ابھی تک دشمنِ صبر و شکیبائی نہ تھا

تلخیٔ حق سے ابھی نا آشنا گفتار تھی
عقلِ انسانی ابھی پابستۂ اِنکار تھی
سر بلندوں کی جبیں سجدے سے نُورانی نہ تھی
حُسن تھا پر عشق کی کچھ ایسی ارزانی نہ تھی
چشمِ انساں میں ابھی تک جُستجو حیراں نہ تھی
سینۂ انساں میں آہِ نیم شب لرزاں نہ تھی
آنکھ میں آنسو نہ تھے سَر میں نگوں ساری نہ تھی
قلبِ مومِن کی جہاں میں گرم بازاری نہ تھی
خواب میں آسُودہ اِبراھیمؑ کی تکبیر تھی
ہیبتِ ضربِ کلیمؑ اِک خوابِ بے تعبیر تھی
بربطِ داؤدؑ اک مدّت سے رہنِ زنگ تھی
مے تو تھی لیکن بہت بے کیف و کم رنگ تھی

تُو نے آتے ہی بدل دی طرحِ تقویمِ حیات
ہو گئیں پابندِ امکانِ عمل ناممکنات

قالبِ ہستی میں دوڑا دی شعارِ زندگی
ہو گئی ارزاں ترے دم سے متاعِ زندگی

اِس قدر تُو نے بڑھائی قیمتِ خود آگہی
مردِ مومن کی نظر میں بوریا، تختِ شہی

اِس طرح توڑا طلسمِ باطلِ حرص و ہوس
چشمِ اعرابی میں کسریٰ کا تجمّل، خار و خس

زندگی تیرے لئے اِک داستانِ عشق و مرگ
یہ جہانِ بے ثبات اِک کاروانِ عشق و مرگ

پیکرِ گِل کو کیا توحید کا سرِّ جلی
خاک کو دی قدرتِ نشوِ حُسینؑ ابنِ علیؑ!

مجاز

زندگی قصۂ طولانیٔ یک دردِ فراق
مرگ افسانۂ یک عشرتِ وصلِ محبوب
گاہے گاہے بہ مجاز آ کہ نظر بیتاب است
اے کہ ہستی پسِ ہر پردۂ ظاہر محجوب

احمد شجاع

سرِّ اکبر

وُہ لامکاں خالقِ زمین و زماں وُہ پروردگارِ ہستی
کہ جس کے فیضِ نمو سے جوبن پہ ہے شبابِ بہارِ ہستی
اگر سمندر بنیں سیاہی تمام برگ و گیاہ کاہی
تو پھر بھی ممکن نہیں بیانِ ستائشِ کردگارِ ہستی
ہوئی جب اُس کے کمال کو اپنے حُسن کی دید کی تمنّا
نظامِ عالم کی طرح ڈالی کھلا دیا لالہ زارِ ہستی

بشر کو اپنا جمال بخشا بشر کو اپنا جلال بخشا
سپردِ اِس آب و گل کے پیکر کے کر دیا کار و بارِ ہستی

بہت کڑی تھی یہ آزمائش بڑی بلا کا یہ امتحاں تھا
مگر بشر کے جگر کو دیکھو اُٹھا لیا سر پہ بارِ ہستی

جہاں نے رنگِ الست دیکھا مکاں نے نقشِ ہست دیکھا
زمیں نے آنکھیں بچھائیں اپنی کہ آ گیا مردِ کارِ ہستی

پڑی بِنائے نیابتِ حق بشر نے پائی خلافتِ حق
اسی کو خلعت یہ راس آیا لقب ملا تاجدارِ ہستی

ہوئے قدم بوس سب ملائک کہ آ گیا اشرف الخلائق
تجلیاں بے نقاب نکلیں کہ آ گیا پردہ دارِ ہستی

ندا یہ گونجی فلک پہ کہ ابنِ آدمؑ ہے سِرِّ اکبر
یہی ہے آئینہ سازِ ہستی یہی ہے آئینہ دارِ ہستی

فاروقِ اعظم رضؓ

عمرؓ فاروق وہ آئینۂ اطوارِ پیغمبرؐ
وہ جس کی ذات میں تھے منعکس انوارِ پیغمبرؐ
وہ جس کے ہاتھ میں تائیدِ ربّانی کی سطوت تھی
وہ جس کا سینہ تھا گنجینۂ اسرارِ پیغمبرؐ

وہ جس کے عزم کے آگے قضائیں کانپ جاتی تھیں
وہ جس کی ایک جنبش سے فضائیں کانپ جاتی تھیں
وہ جس کی چشمِ خشم آلود کی اک برق پاشی سے
جفاکارانِ عالم کی جفائیں کانپ جاتی تھیں

وہ جس کے جوشِ ایماں سے ندا تکبیر کی گونجی
زمیں سے آسماں تک، آسماں سے عرشِ اعظم تک
صدائے بازگشت اُس نعرۂ توحید کی اب تک
سُنی جاتی ہے ہر صبح و مسا اکنافِ عالم تک

پھر اُس مردِ حق کے عدل کی کچھ ایسی اچھی تھی
کہ دستورِ جہاں بانی اُسی سانچے میں ڈھلتا تھا
خدا کا خوف کچھ ایسا رچا تھا اُس کی فطرت میں
کہ اُس کی ہر سیاست سے بھی پہلو نکلتا تھا

جلال اُس بے ریائے بوریا ساماں کا ایسا تھا
کہ اُس کو دیکھ کر خاقان و کسریٰ سہم جاتے تھے
قدم اُس کا کبھی میدان میں بڑھ کر نہ رُکتا تھا
کہ اُس کے سامنے صحرا و دریا سہم جاتے تھے

دہل جاتے تھے سینے اُس کی تکبیروں کی ہیبت سے
خوشا اُس کا رہِ ایمان میں سینہ سپر ہونا
سعادت سی سعادت ہے، لکھا تھا اُس کے ہاتھوں سے
نہالِ ملّتِ بیضا کا بار برگ و ثمر ہونا

مساواتِ بشر کے باغ کی وہ آب یاری کی
کہ نخلِ آبروئے نوعِ انساں میں ثمر آیا
ہر اک فرعونِ بے ساماں کی بے سامانیاں جانچیں
پڑے داد اُس کے آگے جب کوئی بے بال و پر آیا

امیری میں فقیری اور فقیری میں شہنشاہی
امیر المومنین فاروقِ اعظم رضؓ کی وراثت ہے
امیرِ قوم ہو کر رات دن خدمت رعایا کی
یہی اک مردِ مومن کی حکومت اور امارت ہے

تعمیرِ بشر

بیکار ہے انساں کا تقدیر سے شکوہ
تعمیرِ بشر کیا کوئی بازیچہ گری ہے؟
ترکیبِ جہاں میں یہ تکلّف یہ تنوّع
بے سود سی اِک چیز ہے یا بے ہنری ہے؟
آرائشِ ہستی میں یہ ترتیب یہ تدریج
بیکار ہے یا فکر کی آشفتہ سری ہے؟

واں جامِ سفالی میں بھی پانی نہیں ملتا!
یاں ساغرِ بلّور ہے اور لال پری ہے
واں فصلِ بہاری میں بھی بے برگ ہے حسرت
یاں کشتِ تمنّا کہ خزاں میں بھی ہری ہے
عُریاں ہے وہاں جسم کا سرمایۂ خوبی
یاں زیرِ قدم قاقُم و سنجابِ دری ہے
واں حُسنِ خداداد بھی محرومِ تماشا
آرائشِ مجبور یہاں عشوہ گری ہے!
دن رات کے فاقے ہیں وہاں خوانِ غنیمت
یاں کثرتِ صد آز کہ دن رات بھری ہے
یاں حاجبِ دربان و سراپردۂ اقبال
رُسوا سرِ بازار وہاں دربدری ہے

اِس ربطِ بے ربط کا بارِ ربطِ ترنّم!
کِس زیر و بمِ نغمہ کی جادُو اثری ہے
خاموش! کہ ساحرؔ یہ نہاں خانۂ اسرار
جُراْت شکنِ حوصلۂ پردہ دری ہے

رختِ ہستی

کیا مشکل تھا نظرِ قدرت کو کہ جہاں میں خوشی ہی خوشی ہوتی
کیوں غم کا زہر جھلکتا ہے اِس دُنیا کے پیمانے سے
کیا مَیں یہ سمجھ لُوں پایا ہے کچھ رازِ مسرّت مستوں نے
جس وقت بھی دیکھو اُٹھتی ہے ہُو ہائے طرب میخانے سے
ساحرؔ اِس ساز کے پردے ہیں یہ نغمۂ شادی و نوحۂ غم
یہ رختِ ہستی بنتا ہے سُکھ دُکھ کے تانے بانے سے!

تخیّل

اے تخیّل، اے جہانِ شاعرِ خلوت نشیں
فیض سے تیرے نظر پہنچی سرِ عرشِ بریں
شوق کی بیباکیوں کو تجھ پہ کتنا ناز ہے
خندہ زن اوجِ ثریّا پر مری پرواز ہے
تو نے اک قطرے میں پیدا جوشِ دریا کر دیا
ذرّۂ ناچیز کو وسعت میں صحرا کر دیا
کر دیا پروانے کے پر سے نمایاں رازِ عشق
نالۂ بیتابِ بلبل کو بنایا سازِ عشق
گرمیٔ بازارِ حسن و عشق تیرے دم سے ہے
میرے نظّارے کی رونق تیرے جامِ جم سے ہے

شاعر

ساقی نے کچھ ایسی مے پلائی   وہ کیفِ شبِ سیاہ لائی
جس کیف کا ساز خامشی ہے   جس کیف کا سوز بیخودی ہے
شاخوں پہ پھول سو گئے ہیں   پتّے بے ہوش ہو گئے ہیں
سرہنگِ فلک بہک رہے ہیں   تارے آنکھیں جھپک رہے ہیں
حرکت مفقود ہو گئی ہے   شورش نابود ہو گئی ہے
ہر شے پہ سکوت حکمراں ہے   آرام متاعِ کارواں ہے
ہے موت سے زندگی ہم آغوش   ہے زندہ جہاں اِک عکسِ خاموش
شاعر کی مگر نگاہ بیدار   اِس عالمِ بےہُشی میں ہُشیار
بیگانۂ خواب، جستجو سے   بےتاب و خراب، آرزو سے
خوابیدہ جہاں کی پاسباں ہے   اِس حسنِ خموش کی زباں ہے

مقدّر

میں وہ میکش ہوں کہ شرمندۂ ساقی نہ ہوا
میں وہ موسےٰ ہوں کہ ممنونِ تجلّی نہ ہوا
موجِ طوفاں سے یہ ہمّت کبھی بیدل نہ ہوئی
ناتوانی مری منّت کشِ ساحل نہ ہوئی
رشکِ بت خانۂ آزر ہے مری ویرانی
مایۂ نازِ سکندر ہے مری حیرانی
خندہ زن جورِ فلک پر ہے مری خودداری
بے نیازِ دمِ عیسےٰ ہے مری بیماری
گردشِ چرخِ ستم گار سے کیا ڈر مجھ کو
لیے جاتا ہے کہیں میرا مقدّر مجھ کو

اللہ باقی

فرعون اور اُس کی سطوت بھی دیکھی
قارون اور اُس کی دولت بھی دیکھی
شدّاد اور اُس کی جنّت بھی دیکھی
چشمِ فلک نے کیا کیا نہ دیکھا
اللہ باقی مِن کُلِّ فانی

مصر اور بابل کے مینار دیکھے
پندار کے گرم بازار دیکھے
بدمست دیکھے ہُشیار دیکھے
چشمِ فلک نے کیا کیا نہ دیکھا
اللّٰہُ باقی مِن کُلِّ فانی

تاتاریوں کے طُوفان دیکھے
ساسانیوں کے سامان دیکھے
خاقان دیکھے، ہامان دیکھے
چشمِ فلک نے کیا کیا نہ دیکھا
اللّٰہُ باقی مِن کُلِّ فانی

ظلم و ستم کے سیلاب دیکھے
قہر و غضب کے گرداب دیکھے
دل اہلِ دل کے بیتاب دیکھے
چشمِ فلک نے کیا کیا نہ دیکھا
اللہ باقی مِن کُلِّ فانی

نمرود کی کبریائی بھی دیکھی
جمشید کی خودنمائی بھی دیکھی
بندے اور اُن کی خدائی بھی دیکھی
چشمِ فلک نے کیا کیا نہ دیکھا
اللہ باقی مِن کُلِّ فانی

اللہ اکبر

گردش فلک کی جس کو ہٹا دے
لغزش قدم کی جس کو گرا دے
جس کی کمر کو پیری جھکا دے
سمجھتی نہیں ہے اُس کو بڑائی
اللہ اکبر اللہ اکبر

جس کا کمال اِک بودی عمارت
جس کا جمال اِک فانی حرارت
جس کا شباب اِک اوچھی شرارت
سجتی نہیں ہے اُس کو بڑائی
اللہ اکبر اللہ اکبر

کنجِ عدم سے تا گورِ ویراں!
گردن ہو جس کی رسوائے احساں
بڑھنا ہو جس کا گھٹنے کا عنواں
سجتی نہیں ہے اُس کو بڑائی
اللہ اکبر اللہ اکبر

جس کا غرور اک جھوٹی کہانی
جس کا سرور اک خوابِ جوانی
جس کی فنا کا قصّہ بھی فانی
سجتی نہیں ہے اُس کو بڑائی
اللہ اکبر اللہ اکبر

انجام

گردش میں ہیں دن رات یہ مہر و مہ و انجم
اُٹھ تو بھی تو بیدار ہو سامانِ سفر باندھ
شام آتی نہیں شام کا وقت آنے سے پہلے
انجام کا کیا خوف ہے ہمّت کی کمر باندھ

آلامِ دید

بے خبر دیکھ! تو دو دن کی جوانی پہ نہ جا
آنی جانی ہے یہ، اِس عشرتِ فانی پہ نہ جا
اِس فسونکار کی آشفتہ بیانی پہ نہ جا
آنکھ رکھتا ہے تو دریا کی روانی پہ نہ جا
میں نے دریاؤں کو چڑھ چڑھ کے اُترتے دیکھا

اِس کی باتوں میں نہ آ پیرِ کہن سال ہے دہر
جس کی تفصیل نہیں کوئی وُہ اِجمال ہے دہر
تہی آغوش مثالِ کفِ غربال ہے دہر
مجُھ پہ روشن ہے کہ بازیچۂ اطفال ہے دہر
مَیں نے اِس کھیل کو بن بن کے بگڑتے دیکھا

اِس خرابات میں رِندانِ خراب آئے بہت
مستِ پندار حریفِ مئے ناب آئے بہت
اِس میں انجم خُدَم و ماہ رکاب آئے بہت
سینۂ قُلزمِ ہستی پہ حَباب آئے بہت
مَیں نے اِس بزم کو بس بس کے اُجڑتے دیکھا

یہ وہ محفل ہے جہاں دور میں جام آئے گئی
یہ وہ منزل ہے جہاں برق خرام آئے گئی
یہ وہ ساحل ہے جہاں تشنہ مرام آئے گئی
حشر آشوب یہاں بر سرِ بام آئے گئی
میں نے یہ قافلہ آ آ کے گزرتے دیکھا

اِس چمن میں گُلِ صد برگ پریشاں دیکھے
صاحبِ نام و نگیں سوختہ ساماں دیکھے
مسکنِ زاغ و زغن گنبد و ایواں دیکھے
دربدر خاک بسر حسرت و ارماں دیکھے
مَیں نے اِس باغ کو کھِل کھِل کے بکھرتے دیکھا

اے ابنِ آدمؑ

اے ابنِ آدمؑ آگے بڑھے جا
محنت کے دُکھ سُکھ دل پر سہے جا
آگے بڑھے جا اور یہ کہے جا
اے ابنِ آدمؑ آگے بڑھے جا

لوہے کی چھاتی پہ مونگ دَل دے
چُٹکی سے اپنی پتھر مسل دے
پاؤں کے نیچے سب کچھ کچُل دے
اے ابنِ آدم آگے بڑھے جا

آگے بڑھے جا مشکِل پہ ہنس کر
گردن جھکا مت دلدل میں دھنس کر
آزاد رکھ دِل دھندوں میں پھنس کر
اے ابنِ آدم آگے بڑھے جا

تقدیرِ انساں عیش و الم ہیں
یہ سازِ ہستی کے زیر و بم ہیں
جب تک ترے جسم اور جاں بہم ہیں
اے ابنِ آدم آگے بڑھے جا

کسی کی تلاش

تاروں بھری رات کی فضا میں مہتاب کے ساغرِ ضیا میں
عاشق کی فغانِ بے نوا میں
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

بیتابیٔ موجِ آبِ جُو میں سرشاریٔ جوششِ سبُو میں
شب ہائے طرب کی ہاؤ ہُو میں
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

دامِ گیسوئے خم بہ خم میں برقِ رُخِ روشنِ صنم میں
جادُوئے نگاہِ پُر ستم میں
آنکھیں مِری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

بُلبل کے بُکائے بے اثر میں پروانۂ بے جگر کے پر میں
معصومئ نکہتِ سحر میں
آنکھیں مِری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

فریادِ دلِ حزیں لئے ہیں بے کس کی دُعا، دُکھی کی لے ہیں
شوخی و سُرور رنگِ مے میں
آنکھیں مِری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

انوارِ جبینِ نازنیں میں دُنبالۂ چشمِ سُرمگیں میں
عکسِ رُخسارِ آتشیں میں
آنکھیں مِری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

توکّل

اللہ پہ چھوڑو کام سبھی وہ ہے اپنا تو سب کچھ ہے
بے بس بندوں کو کیا کرنا وہ ہے داتا تو سب کچھ ہے
کچھ آج کمائی کر ایسی جو کل کو چل کر کام آئے
یاں سب کچھ ہے تو کچھ بھی نہیں واں کچھ بھی ملا تو سب کچھ ہے
ہیں خدمتِ خلق اور ذکرِ خدا دو کام فقط انسانوں کے
دُکھ بانٹ کے اُس کے بندوں کا وہ نام جپا تو سب کچھ ہے
اے ساحرِ دُنیا والوں نے گر چھوڑ دیا تو کیا غم ہے
وہ دین اور دُنیا کا مالک جب ہے تیرا تو سب کچھ ہے!

نکات

حقائق چھوڑ کر جس نے کیا اوہام کو ہادی
لکھی ہے صاف لوحِ آسماں پر اُس کی بربادی

جو قومیں دہر میں ناعاقبت اندیش ہوتی ہیں
نہیں آتا ہے قد پر راست اُن کے رختِ آزادی

ترقی کرنے والے منزلِ مقصود پر پہنچے
مگر ہم گردشِ تقدیر کے اب تک ہیں فریادی

نہ استقلال کی ہمّت نہ استیصال کی طاقت
نہ اپنے قلب نورانی نہ اپنے ہاتھ فولادی

توکّل کو کیا بدنام بےکاری کی بدعت سے
تعطّل کو قناعت کہہ دیا یہ فتنہ ایجادی

برا ہے شہی ملبّر آ نہیں سکتی تجھے واعظ
ترے اقوال نمرودی، ترے اعمال شدّادی

غریبوں کو حقارت سے نہ دیکھ اے منعم ناداں!
کہ اب اُن پر عیاں ہے مرتبوں کی سُست بنیادی

ترے اشعار کی صہبا میں وہ تندی ہے اے ساحر
کہ اُس نے ایک بجلی سی رگِ عالم میں دوڑا دی

سکوں آموختی اشکِ طپاں را کہ جگر بالد
چہ کردی آبروئے خویش را از دستِ خود دادی

تراشیدی بُتے او را خدا گفتی خدا کردی
ملک بودی ز اوجِ عرش افتادی چہ افتادی!

تفاخر زیبد ار از اصلِ خود بیگانہ کم باشی
بہ بیں ایں خاک زیرِ پائے خود را کہ ہمیں زادی

غزل

کوئی چارا ہی نہیں عشق کی بیماری کا
یہ ہے اک سلسلہ انسان کی لاچاری کا

روز پیمانِ وفا، روز شکستِ پیماں
یہ بھی شاید کوئی انداز ہو دِلداری کا!

یُوں گھٹاتا تھا تو اتنا نہ بڑھایا ہوتا
سیکھتے کوئی سلیقہ تو سِتمگاری کا

اس جوانی میں ہر اک چیز مزا دیتی ہے
ہائے وہ لُطف جوانی کی زیاں کاری کا

کھو گئے ایک ہی جلوے میں سرِ طُور کلیمؑ
کس کو دعوےٰ ہے ترے سامنے ہُشیاری کا

حشر میں ڈھونڈھ رہی ہے تری رحمت مجھ کو
یہ بھی اعجاز ہے اک میری گنہگاری کا

ساغر آب بھی کہیں ملتا ہے تو میخانے میں
کس قدر پاس ہے اس رند کو خودداری کا

کس کی تلاش ہے کہ ہر اک رہگذر کو میں
یوں دیکھتا ہوں جیسے کوئی چیز کھو گئی

یہ وقت نزع ہے بیمار غم کی آخری شب ہے
ستمگر جیلہ جواب تو یہ صبح و شام رہنے دے

اُفق پہ دھواں سا یہ کیا اُٹھ رہا ہے
ترے حق میں ظالم دُعا ہو رہی ہے

عہدِ حاضر

عہدِ حاضر کی لڑکیوں سے کہو
تم سے پہلے بھی لڑکیاں تھیں بہت

نازنیں، حور وش، پری اندام
حُسن میں اُن کے شوخیاں تھیں بہت

اُن کی آغوش میں پلے وہ جواں
خون میں جن کے گرمیاں تھیں بہت

عِصمت و عِفّت و حیا و وفا!
اُن کے گھر کی یہ لونڈیاں تھیں بہت

ہاں تمہاری نظر سے گر دیکھیں
اگلے وقتوں میں سختیاں تھیں بہت

تم کو آزادیاں میسر ہیں!
پاؤں میں اُن کے بیڑیاں تھیں بہت

تم ہو ہر فن میں طاق اور بیباک
بے ہنر تھیں وُہ بے زباں تھیں بہت

پر کبھی تم نے اِس پہ غور کیا
گرچہ جاہل یہ بیبیاں تھیں بہت

تم سے آباد ایک گھر نہ ہُوا
اُن سے آباد بستیاں تھیں بہت

بے حجابی

(ایک بے حجاب دوشیزہ کو دیکھ کر)

لائے گی اِک دن ہم پہ خرابی — یہ بے حجابی، یہ بے نقابی
مجلس میں رقصاں نازِ خراماں — محفل میں غلطاں حُسنِ شرابی
رخسارِ سیمیں میں خونِ گُلگوں! — مینا میں جیسے مَے ہو گلابی
ہونٹوں پہ سُرخی آنکھوں میں کاجل — سینے پہ آنچل وہ بھی تو، آبی
عشرت کدوں میں رونق ہے تجھ سے — گھر پہ مسلّط خانہ خرابی!
اے خانہ برباد سیکھی ہے کس سے — یہ شوخ چشمی، یہ بے حجابی

کب تک خدارا یہ شور و مستی
یہ خود نُمائی، یہ خود پرستی!

بہار

فسوں طرازیاں غضب ہیں موسمِ بہار کی
نظر نوازیاں عجب ہیں صحنِ لالہ زار کی
کہیں کھلی ہے موتیا، کہیں کلی انار کی
رُخِ چمن پہ سُرخیاں ہیں چہرۂ نگار کی
جدھر بھی آج دیکھئے بہار ہی بہار ہے

نُمو کا فیض روکشِ طلسمِ زرنگار ہے
ہر ایک شاخسار گلبدن ہے گل عذار ہے
ہر ایک سبزہ زار نورِ چشمِ روزگار ہے
زمانہ کامیاب ہے ہر ایک کامگار ہے
جدھر بھی آج دیکھئے بہار ہی بہار ہے

زہے کمالِ عیش ہر شجر سبو بدست ہے
بہار پی گئی شراب آج باغ مست ہے
نہ اس کو فکرِ نیست ہے، نہ اُس کو فکرِ ہست ہے
کلی دلوں کی کھل گئی عجیب بندوبست ہے
جدھر بھی آج دیکھئے بہار ہی بہار ہے

ہوائیں خوشگوار ہیں، فضائیں مُشکبار ہیں
سحاب مُشک بار ہیں، حجاب تار تار ہیں
یہ جوئبار و مرغزار، عرصۂ تتار ہیں
وہ لالہ زار پُر بہار حجلۂ نگار ہیں
جدھر بھی آج دیکھئے بہار ہی بہار ہے

کسان

کدال پر جھکا ہؤا زمیں میں گاڑ کر نظر!
یہ کون ہے کھڑا ہؤا شکستہ دل خمیدہ سر
ہزارہا برس کے ظلم و جور سے دبا ہؤا!
شقاوتِ بشر سے مثلِ گرد رہ پسا ہؤا
فلک کی گردشوں کو دیکھ کر نظر جھکی ہوئی!
جہانِ بے کراں کے بوجھ سے کمر جھکی ہوئی
یہ کس نے اس کو کر دیا ہجومِ غم میں مبتلا
نہ آرزو نہ حسرتیں نہ کوئی اس کا آسرا
یہ کون ہے کہ اس کو زندگی سے احتراز ہے
یہ کون ہے کہ ہر اُمید سے یہ بے نیاز ہے

مشرق و مغرب

تیرا مآلِ زندگی پردہ دریٔ ممکنات
میرا کمالِ زندگی حفظِ تجلیاتِ ذات

تیری اساس حسن ہے میری اساس عشق ہے
تیری بقا بھی بے ثبات میری فنا بھی بے ممات

تیرا جلال اور جمال درخورِ رنجِ انقلاب
میرا نیاز اور گداز سدِّ شرورِ کائنات

قبضۂ برق و باد اُدھر خفتہ بوریا اِدھر
کبر و ریا کے ہیں نگر و ظرفِ تجلیات

ذکر بہ ساز و ارغنوں، فکر بہ دانہ ہائے سبحہ
یہ بھی ہیں سب تکلّفات وہ بھی ہیں سب تکلّفات

زمزمہ ہائے بزم و رزم ہمہمہ ہائے عیش و عزم
بندۂ حرص و آز کے جھوٹے ہیں سب تصوّرات

ہمّتِ بارکش کو اب عیش نے کر دیا زبوں
ورنہ زیادہ کچھ نہیں پہلے سے اُس کی مشکلات

بُت وہی بُتکدے وہی عام ہے رسمِ بُتگری
پیکرِ آب و گِل ہیں سب آدمی ہوں کہ سومنات

ساحر زاویہ نشیں فکرِ نظامِ نو میں ہے
رات کو کر رہا ہے دِن، دِن کو بنا رہا ہے رات

خداوندانِ مغرب

باخداوندانِ مغرب این پیام از من بَبر
زینتِ فرقِ شُما باد اکلاہِ سَروری

علم و عقل و جسم برجانِ شما ارزاں شداست
ہر کہ این دارد بسَزد برِاُو قبائے برتری

بہرۂ اقوام را در دستِ گیرائے شُما
داد آں داور کہ ذاتش بے نیاز از ہمسری

قسمتِ انساں مگر بازیچۂ اطفال نیست
تا کسے سازد از یں چوگان و گوئے داوری

خرابات

مرجعِ رندانِ بے پروا خراباتم ہنوز
فارغ از اندیشۂ فردا خراباتم ہنوز

در خورِ من نیست آں صہبا کہ ریزندش بخاک
مایہ دار از خوردۂ مینا خراباتم ہنوز

بر نہ چینیم رنگِ نو از گلعذارانِ چمن!
پُر ز خونِ لالۂ صحرا خراباتم ہنوز

گرچہ مینا شد تہی از بادہ و ساقی نہ ماند
در نگاہِ آں بُتِ ترسا خراباتم ہنوز

قیس گر بیگانہ شد از رسمِ جاں بازی چہ باک
گرم از افسانۂ لیلےٰ است دنیا تم ہنوز

جرعۂ دُزدیدہ از جامِ من مے خانہ ساخت
آں کہ از کم ظرفیش رسوا است دنیا تم ہنوز

می چکد از جانِ ساحر خونِ رنگینے چو لعل
بے نیازِ منّتِ رنگ ہا است دنیا تم ہنوز

کشتۂ دید

متاعِ بیش قراری دماں ندیدستیم!
ہمیں بس است کہ از کشتگانِ دیدستیم!
مگر تو آئی بہ بالینِ ما پس از مُردن!
چہ جور ہا کہ بجانِ حزیں کشیدستیم!

مئے الست

آں مئے تند کہ در ساغرِ من ریختہ اند
ہمچو جانیست کہ در قالبِ تن ریختہ اند
جرّعۂ بود نہ دُردِ مئے رندانِ الست
کہ بہ کامِ منِ تفتیدہ دہن ریختہ اند
مگر آمد بہ رہِ قیس دگر مجنونے!
خارہا ہست کہ در دشت و دمن ریختہ اند
گلہ دارد ز تنگ ظرفیِ اربابِ نظر
آں خرابات کہ در خاکِ چمن ریختہ اند

نہ سزد شکوۂ اعدا کہ دریں خاکِ زبوں!
آبروئے وطن ابنائے وطن ریختہ اند
آنچہ در طاقِ ازل بود ز صہبائے قدیم
بہ روانِ شہ جم جاہِ دکن ریختہ اند
ساحر از بزمِ طرب رفت بہ صحرائے جنوں
چہ متاعے کہ حریفانِ کہن ریختہ اند

دلیرانہ زی

اگر تو فقیری، امیرانہ زی
اگر تو امیری، فقیرانہ زی
اگر سر بلندی، نگونسار باش
وگر زیر دستی، دلیرانہ زی

مئے حلال

حذر ز ایمانِ کج نگاہے کہ مردِ حق را غلام سازد
بُتے تراشد ز خاکِ بیچارہ را خدائے انام سازد

بہ حیرتم در جہانِ فردا چہ بہرہ می رسد بہ قومے
کہ ہر زباں در قلندرے را بہ مسجد اندر امام سازد

بہ پیرِ مے خانہ رندِ بدمست گریہ می کرد و نعرہ می زد
کہ واعظِ حیلہ جو بُتے دیگرے بہ بیتُ الحرام سازد

جہانِ مزدور تلخ کام از تطاولِ چرخِ سفلہ پرور
مگر بہ بیں خواجۂ خرد بُردہ با صراحی و جام سازد

علاجِ اندوہِ زندگانی کجاست جز مستی و جوانی
حلال کردم مئے کہ غم را حرام گیرد حرام سازد

بہ خلوت اندر جبینِ زاہد بسینۂ تکمیدِ کفرِ باطل
مگر رکوع و سجود بنگر کہ او بہ بالائے بام سازد

بہ گوشۂ در نشستہ ساحر بہ فکرِ تعمیر آں جہانے
کہ عظمت ایں آں نہ داند بہ لطف با خاص و عام سازد

شرابِ ناب

شرابِ ناب ناورِ جہان ناک است
مرا از گردشِ گردوں چہ باک است
بہ چشمت روزِ روشن تیرہ گیہا
بہ جامم تیرہ شبہا تابناک است

سر فضل حسینؒ

مٹنے کو مِٹ چکی تھی مُسلماں کی آبرو
پر تیری موت نے تو ڈبو دی رہی سہی
محفل کی گرمیاں تھیں ترے دل کے سوز سے
"یہ شمع تھوڑی تھی پر بہت تھی"

احمد یار خان

لگتا کہیں نہیں دلِ حیراں ترے بغیر
رہتا ہوں رات دن میں پریشاں ترے بغیر
تُو تھا تو میری زیست میں کتنی تھیں وسعتیں
اَب وسعتیں جہاں کی ہیں زنداں ترے بغیر

تصوّرات

نمائش

زور بے سود ہے گر ہاتھ میں تلوار نہیں
عقل بے کار ہے گر قدرتِ اظہار نہیں
عِلم بے مایہ ہے گر طاقتِ گفتار نہیں
حُسن اِک عیب ہے گر آدمی زردار نہیں
کوئی قیمت ہی نہیں زر کی، نمائش کے بغیر
قدر کھلتی نہیں جوہر کی، نمائش کے بغیر

قسمت

بہانہ ہے غلط کاروں کے دِل کی عذر خواہی کا
سہارا ہے یہ بے ہمّت غریبوں کی تسلّی کا
یہ اِک دلکش کھلونا ہے ہراک بیکار ہستی کا
یہ قسمت، راز ہے اِنساں کی قسمت کی خرابی کا
وہ بے ہمّت ہیں جو تقدیر کے دھوکے میں آتے ہیں
جو باہمّت ہیں اپنی قسمتیں خُود ہی بناتے ہیں

عورت

وفا کی جان ہے شرم و حیا کی کان ہے عورت
جہاں کا مان ہے کون و مکاں کی شان ہے عورت
سراپا مہر و جود و الفت و احسان ہے عورت
بہت کمزور ہے لیکن بڑی بلوان ہے عورت
اسی کے دم قدم سے زینتیں ہیں بزم ہستی کی
اسی کی خود فراموشی اجل ہے خود پرستی کی

تن آسانی

غریبوں کا ہے ورنہ سہل انگاری، تن آسانی
اسی سے بادشاہوں کو ملی دردر کی دربانی
بڑھا دیتی ہے مشکل کو ارادوں کی پریشانی
مٹا دیتی ہے ناکامی کو ہمّت کی فراوانی
بہادر منزلِ دُشوار کو آساں سمجھتے ہیں
شکستوں ہی کو اپنی فتح کا ساماں سمجھتے ہیں

اِنتظارِ بہار

باغ میں جب حُسنِ گل ہو صرفِ تاراجِ خزاں
زندگی پر چھائے جب طوفانِ مرگِ ناگہاں
جب ہر اک برگِ شجر ہو شرحِ یادِ رفتگاں
شاخِ عُریاں پر ہو بُلبل، ایک آہِ ناتواں
فارغ از اندیشۂ فردا ہے چشمِ انتظار
ہے قرارِ جانِ مضطر ایک اُمّیدِ بہار

اُمیدِ سحر

حُسنِ مشرق پردۂ مغرب میں جب رُوپوش ہو
کاروانِ ماہ و انجُم خانماں بردوش ہو
ظلمتِ شب خانہ براندازِ صبر و ہوش ہو
جب وفورِ درد سے بیمارِ غم خاموش ہو
مایۂ تاب و تواں ہوتی ہے اُمّیدِ سحر،
محوِ دیدِ مطلعِ خورشید رہتی ہے نظر!

زندگی

اپنے سُکھ کو تیاگ غیروں کی خوشی کے واسطے
جان دیدے دُشمنوں کی زندگی کے واسطے
وہ بھی کیا جینا ہے جو ہو اپنے جی کے واسطے
ہے وہی زندہ جو مرتا ہے کسی کے واسطے
جس نے اپنی جان غیروں کے لئے قربان کی
یاد مِٹ سکتی نہیں دُنیا سے اُس انسان کی

بُت گری

بُت شکن! بُت گری غیروں نے سکھائی تجھ کو
توڑ کر عہدِ کہن شرم نہ آئی تجھ کو
بُت کافر کی ادا کون سی بھائی تجھ کو
کچھ تو سُن کہتی ہے کیا آج خدائی تجھ کو
کفر ہنستا ہے کہ تو صاحبِ ایماں نہ رہا
ناز تھا جس پہ خدا کو بھی، وہ انساں نہ رہا

پنجاب

وہ ملک جس کو زمانے میں انتخاب کہیں
وہ دیس جس کو خدائی میں لاجواب کہیں
وہ خاکِ پاک جسے آسمان جناب کہیں
وہ مرز بوم جسے رحمتوں کا باب کہیں
وہ سرزمین ہے پنجاب کے جوانوں کی
جری دلیروں کی، شیروں کی، پہلوانوں کی

وقت

ہے وقت ایک سیف جو ہر دم ہے بیقرار
اِس کا اثر ہے عمر پہ ہر شے کی، آشکار
جو کام آج کا ہے نہ کل ہو گا زینہار
کرتا نہیں ہے وقت کسی کا بھی انتظار
جُل دے کے بھاگ جانے کی عادت ہے وقت کو
انساں کی کوششوں سے رقابت ہے وقت کو

بے زری

اِس غریبی ہی سے پامال بشر ہوتا ہے
اِس سے ہی عزّت و عصمت کو خطر ہوتا ہے
زر سے انسان کا ہر عیب ہنر ہوتا ہے
زر ہو گر پاس تو پتھّر بھی گہر ہوتا ہے
بے زری زندگی کو موت بنا دیتی ہے
حسُن کو بر سرِ بازار بکا دیتی ہے

جوانی

جوانی کی امنگوں کے لئے آہ و فغاں کب تک
مئے پُر کیف کی سرشاریوں سے دل جواں کب تک
یہ مانا بحر میں طوفان بھی اُٹھتے ہیں اے ساحرؔ
کنارے پر نہ لگتی کشتیٔ عمرِ رواں کب تک

عیشِ باقی

پیئے جا دم میں دم جب تک ہے اے آتشِ بجاں باقی
پیئے جا خُم میں جب تک ہے شرابِ ارغواں باقی
فنا کا خوف مرگِ جاودانِ عیش ہے ساحرؔ
پیئے جا یہ سمجھ کر تو ہے باقی تو جہاں باقی

فریبِ آرزو

جوانی کیا گئی سب کچھ گیا بس ہم کا ب اُس کے
مگر اک یاد اُس کی جو ہے دل میں آج تک باقی

فریبِ آرزو مت کھائیو ساحرؔ کہ پیری میں
نہیں جُز یک فنا ہستی کی کوئی بھی جھلک باقی

بے نیازیٔ حُسن

کِسی کے حُسن سے شاہوں کے قصر بُقعۂ نُور
کِسی کا حُسن غریبوں کے گھر کی زینت ہے

رہا ہے حُسنِ ازل بے نیازِ قیدِ مکاں
سُرورِ مے کو کہاں جامِ جم کی حاجت ہے

دَورِ جنوں

پلا شراب کہ فصلِ بہار ہے ساقی
جنُوں کے دَور کا کیا اعتبار ہے ساقی

یہ لال لال سی شے جو بھری ہے مینا میں
علاجِ گردشِ لیل و نہار ہے ساقی

ناپائیدارئ حیات

خبر نہ تھی کہ شبِ رُوئے بہار ہوتی ہے
خوشی شباب کی بے اعتبار ہوتی ہے

بُرا کیا کہ نہ اِتنا بھی آج تک سمجھے
دو روزہ زندگیٔ مُستعار ہوتی ہے

بندۂ حرص و ہوا

دُوسروں کے غم سے جو انساں رہا نا آشنا
بُت ہے پتّھر کا نہیں انساں اُسے کہنا بجا
بندۂ حق ہے بندۂ حرص و ہوا ہوتا نہیں
کور ہے جس کو نظر آیا نہ کچھ اپنے سوا

لالۂ صحرا

اگرچہ غازۂ رُخسارِ بوستاں بن کر
بہت سے گُل ہیں کہ دنیا میں انتخاب ہوئے
مگر کچھ ایسے بھی گُل ہیں کہ کھل کے صحرا میں
کسی کے حُسن کی تصویرِ بے حجاب ہوئے

دولت کا نشہ

بشر زر کے نشے میں ماسوا کو بھول جاتا ہے
خلوص و اُلفت و مہر و وفا کو بھول جاتا ہے

کہاں کی دوستی کیسی مروّت زر بُری شے ہے
کہ اِس کو دیکھ کر انساں خدا کو بھول جاتا ہے

عورت کی ہمدردی

عورتوں کے ایک آنسو میں ہے امرت کا اثر
اِن کی ہمدردی میں پنہاں مرہمِ زخمِ جگر

یہ بسا دیتی ہیں اُجڑے گھر ذرا سی بات میں
اِس جہاں کی زندگی عورت ہے قصّۂ مختصر

گُل و خار

وُہ باغبانِ جہاں جس نے گُل کئے پیدا
اُسی نے ہمدمِ گُل کر دیا ہے خاروں کو
اِنہیں کے دم سے ہے تکمیلِ کارِ عشوۂ حُسن!
نہ دیکھ چشمِ حقارت سے خاکساروں کو

رضا

حُسن دے کر پھُول کو صحرا میں پیدا کر دیا
گوہرِ رخشاں کو وقفِ قعرِ دریا کر دیا
ہے نظامِ زندگی بالا تر از ادراک و فہم
بس یہی کہیئے کہ اُس نے جو بھی چاہا کر دیا

رازِ ہستی

بیا با تو بگویم رازِ ہستی!
کہ ہستی نیست غیر از مے پرستی
تو خود را عاقل و فرزانہ دانی
مگر بے ہوش ہستی گر نہ مستی

دوش و فردا

ازاں رستم ز فکرِ دوش و فردا
کہ آغاز و انجامے ندارم
چہ باکم از فقر و تہی دستی
کہ من برکارِ خود بامے ندارم

فکرِ ساماں

اگر در دِل حسابِ بیش و کم نیست
میندیش از نصیبِ بختِ جم نیست
بمیرد صاحبِ ساماں بہ فکرش
چو سامانے نداری ہیچ غم نیست

یک بار

بہ سُوئیت دَورِ مے یک بار آید
ز دستِ این مایہ را دادن نشاید
بزن چنگ و بخور مے کاندریں دہر
چو یک بار آدمی میرد، نہ زاید

حواس

حواس از نغمۂ مشکِ تتار است
حواس از حُسنِ گُلہائے بہار است
بہ آغوشت اگر سیمیں برے نیست
حواست از نصیبش شرمسار است

وقتِ سازگار

بخیز اے دِل کہ وقتِ سازگار است
خُمِ مَے، فرشِ گُل، ابرِ بہار است
دماغ از آتشِ اندیشہ خالیست
جوانی ہست و یارے در کنار است

خدا امیداری

خدا امیداری و دستِ دعائے
مجو از دہر دُونِ پرورِ دوائے
چرا سر خم کُنی بر آستانہا
نہ دیدی بندہ را حاجت روائے

بختِ کامیاب

بیا امروز بختم کامیاب است
نصیبم خاطرِ جمع و شراب است
بیا بر ہم زنیم ایں کہنہ دفتر
دلِ پُر آرزو ہست و شباب است

گرفتارِ تناسخ

گرفتارِ تناسخ این چه گفتی
بدوران رشتهٔ جانها بسفتی
مگر اندر رنجِ این مرگِ مسلسل
فنا را در بقائے خود نہفتی

باشی نه باشی

چو دانی با تو مرگت هم بمیرد
چرا سنگِ مزارِ خود تراشی
گرفتم باز می آید بهارے
تو بر شاخِ چمن باشی نه باشی

ہَل مِن مزید

سَطوتِ دارائے دہ گرچہ بہ پایاں رسید
از نَفَسَش می دمد آتشِ ہَل من مزید
دیدۂ آں شمع را کُو بہ وداعِ حیات
از نَفَسِ جاں گداز شعلۂ نو آفرید

حیات

حیات از عشق و مرگ افسانہ دارد
خرِد خود را ازیں بیگانہ دارد
شرارِ زندگی، اے عافیت دوست!
مگس را ہست یا پروانہ دارد؟

غمِ دوش

دِلا برخیز تا کے این غمِ دوش
بہ غم یارانہ سازد خود فراموش
اگر امروز و فردا ہم نہ داری
نظر کُن بر پسِ فردا و مَے نوش

پس از مُردن

بہ آغوشِ بُتِ سیمیں بدن زی
بہ پہلوئے چمن ہائے و دہن زی
پس از مردن خموشیہائے گور است
بیا تا زندہ ہستی خندہ زن زی

احسانِ فرومایہ

حذر از منّتِ دونے کہ ہر دم بر زباں دارد
حکایتہائے احسانے کہ بر جانت روا کردست

من از ایں گوژپشتِ چرخ فریادے بلب دارم
کہ پشتِ نوجواناں را بیک گردش دوتا کردست

مآلِ کار

چرا خندید گل گر قسمتش حیراں شدن بودست
چرا تابید مہ گر آخرش پنہاں شدن بودست

چرا آباد شد ویرانہ ہا از دستِ تعمیرے
مآلش گر ہمیں دریک نفس ویراں شدن بودست

حسنِ ازل

اے آنکہ آرامِ جانم ربودی
قربانِ جانت کہ دردم فزودی
حسنت فزوں باد باشم نہ باشم
اے آنکہ ہستی و باشی و بودی

دہرِ دوں

در دل جہانے بنیاد کردم
ویرانہ بود آباد کردم!
ایں دہرِ دوں بود معمورۂ غم
از او گسستم دل شاد کردم

تجلیات

جمالِ غیر

اب دِل جمالِ غیر پہ مائل نہیں رہا
آنکھوں کو شوقِ جلوۂ باطل نہیں رہا
سر میں خیالِ جادہ و منزل نہیں رہا
بندوں کی مدح کرنے کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ داغِ کفر تھا وہ دِل نہیں رہا

دلِ مُستغنی

مُحتاجِ کس و ناکس ہو کیوں دلِ مُستغنی
ہے بے سر و سامانی سامان امیری کا
آغاز محبّت کا، انجام محبّت کا
وہ جوش جوانی کا، یہ ضعف ہے پیری کا
ساحرؔ نہیں باز آتا پھر عشق سے کیا کہیئے
اِس مُجرمِ عادی کو سودا ہے اسیری کا

مرکز

تو اُس نعمت سے ہے محرُوم اے شیدائے آزادی
جسے ہر صاحبِ دانش نے سمجھا جوہرِ انساں
مدارِ عالمِ امروز ہے قوموں کی جمعیّت
یہ شیرازہ بکھر جائے تو ملّت خانماں ویراں
نہیں جس قوم کا فکر و عمل وابستہ مرکز سے
وہ مانندِ گُلِ صد برگ بے ساماں تہی داماں

جسم و رُوح

رنگ و بُو ہے گرچہ گُل میں پر نہیں گُل رنگ و بُو
مے سبُو میں جلوہ گر ہے مے نہیں لیکن سبُو

حُسن

برقِ خرمن سوز ہے، اِک شعلۂ عریاں ہے حُسن
زہرِ شیریں، مرگِ ناگہ، دردِ بے درماں ہے حُسن

ہَوس

ہَوس کی آگ تکمیلِ ہَوس سے بجھ نہیں سکتی
کبھی آتش کی تیزی خار و خس سے بجھ نہیں سکتی

فقر

درویش کو ہوائے ہوس ہائے خام کیا
دُنیا کے مخمصوں سے فقیروں کو کام کیا

آگ

یہ جان جائے تو جائے ہوس نہیں جاتی
یہ آگ وہ ہے جو بجھنے ہی میں نہیں آتی

حرص

ہزار خم ہوں مگر مے سے جی نہیں بھرتا
یہ خواہشوں کا سمندر کبھی نہیں بھرتا

خاطرِ دوست

وہ بندگی جو ادا ہو بہ پاسِ خاطرِ دوست
نماز ہے وہی روزہ وہی ہے حج ہے وہی
خرد نے یوں تو بہت سی نکال لیں راہیں
جو راہ تیری گلی میں نہ جائے کج ہے وہی

انحطاط

زباں کند ہے عقل کھوئی ہوئی سی!
طبیعت میں اب وہ روانی نہیں ہے
قوےٰ ہیں مگر اُن کو کچھ ہو گیا ہے!
بڑھاپا ہے ساحرؔ جوانی نہیں ہے

تبرّکات

شہادت

حضرت امام حسین علیہ السلام

جب تختِ شام پر متمکّن ہوا یزید
دیکھا فلک نے عہدِ ستم دورِ ناسعید
احکامِ شرعِ پاک کی مٹّی ہوئی پلید
ہونے لگے ہر ایک طرف ظُلمِ ناشُنید
چرچا ہُوا جہان میں فسق و فجور کا
گُل ہو گیا چراغ شریعت کے نور کا

سب حامیانِ شرع متین رہبرانِ دیں
بے کار و بے نوا و سر افگندہ و حزیں
حیرت میں تھے کہ کس کو کہیں دین کا امیں
ہے کون جو ہو آج محمدؐ کا جانشیں
دیکھا تو بس مدینے پہ جا کر نظر پڑی!
واں فاطمہؑ کے نورِ نظر پر نظر پڑی!
لکھا کہ مُلکِ شام پہ آفت کا وقت ہے
اُمّت پہ تیری آج مُصیبت کا وقت ہے
اِسلام نزع میں ہے قیامت کا وقت ہے
آ اے حسینؑ تیری رفاقت کا وقت ہے
گر آج تو نہ آیا تو اِسلام مِٹ گیا
ناناؐ کا تیرے نام تو کیا کام مِٹ گیا

خط پڑھ کے بیقرار ہوا فاطمہؑ کا لال
اسلام اور نزع میں! یہ کیا ہے قیل و قال
ابنِ علیؑ کی زیست میں اسلام پر زوال
یہ زندگی وبال ہے یہ زندگی وبال!
لکھّا کہ آرہا ہے محمدؐ کا جانشیں!
اب اُنؑ کے دینِ پاک کو خطرہ کوئی نہیں!

پھر قافلہ امامِ زمن کا رواں ہوا!
ہر اہلِ دل فدائے رہِ کارواں ہوا!
تھے راہ میں کہ ماہِ محرم عیاں ہوا!
دیکھا اُسے تو پیر و جواں نوحہ خواں ہوا!
تھا جس کا انتظار، وہ تقدیر دیکھ لی
ابنِ علیؑ کے قتل کی تحریر دیکھ لی

وہ وقت بھی ہے یاد تجھے اے مہِ مُنیر
تھے درپئے شہادتِ خیرُالورٰے شریر
مکّے میں ہوگیا تھا بپا حشرِ دار و گیر!
شاہِ اُممؐ کی ذات تھی اور حضرتِ امیرؑ
اُس وقت دو تھے آج اکیلا حسینؑ ہے
یارب ہو خیر! فاطمہؑ کا نورِ عین ہے

جب بیکسوں کا قافلہ آیا سرِ فُرات
دیکھا کہ فوجِ کفر لگائے ہوئے ہے گھات
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے ظالموں کے ہات
وہ بات کی کہ کہنے کی ہرگز نہیں ہے بات
کر کے شہید عترتؑ عالی مقام کو!
رُسوا کیا جہاں میں شرافت کے نام کو!

اب فاطمہؑ کے لال کی رحلت قریب ہے
ناموسِ سرمدی کی شہادت قریب ہے
وقتِ وداعِ شافعِ اُمّت قریب ہے
جنت کے بادشاہ سے جنّت قریب ہے
ہے خاتمہ قریب امامِ غریبؑ کا
بجھنے کو ہے چراغ خدا کے حبیبؐ کا

یہ دُودمانِ پاک ہو اس طرح سے تباہ
اُس کی رضا کے سامنے کس کو مجالِ آہ
کیا کام کر گئی تیری غیرت خدا گواہ
صلوٰت تجھ پہ واہ محمّدؐ کے لال واہ
تو نے خدا کی راہ میں سب کچھ لُٹا دیا
مہر و وفا کے نام کا سِکّہ بٹھا دیا

اب دشتِ کربلا میں بلاؤں کا ہے نزول!
اجسامِ پاک اور لگد کوبِ صد خیول
حیران و بے قرار جگر گوشۂ بتولؑ
فرشِ زمیں پہ گریہ کناں عابدؑ ملول
ارماں نکل رہا ہے کسی ناسعید کا
نوکِ سناں پہ سر ہے حسینؑ شہید کا

کیونکہ بیاں ہوں ظالموں کی چیرہ دستیاں
حق کے مقابلے میں وہ باطل پرستیاں
آلِ نبیؐ پہ دست درازی ہیں مستیاں
افسوس زیرِ مشقِ ستم تھیں وہ ہستیاں
جو ضامنِ شفاعتِ خیرُ الانام تھیں
دونوں جہاں میں واجبِ صد احترام تھیں

وہ ظلم ڈھائے آلِ محمدؐ کی ذات پر
دل خونفشاں ہے آج تک اُن سانحات پر
طوفانِ قہر عاجزوں کی بات بات پر
یہ جور اور عترتِ عالی صفات پر
شاید برائے نامِ مسلمان تھے یہ لوگ
ایمان کہہ رہا ہے کہ شیطان تھے یہ لوگ

واں شوخیاں تو دیکھئے دربارِ شام کی
آرائشیں دمشق کے دیوار و بام کی
بزمِ طرب ہے دور میں مستی ہے جام کی
آتی ہے لاش سیدِ خیرُ الانام کی
کیا رونقیں ہیں چہرۂ شمر و یزید پر
کیسی خوشی ہے مرگِ حسینؑ شہید پر

مسند پہ ہے یزیدِ ستمگار اِک طرف
صف بستہ فوجِ کُفر کے سالار اِک طرف
ناموسِ مصطفےٰ اسیرِ دربار اِک طرف
زنجیر بستہ عابدؑ بیمار اِک طرف

تشنگی وُہ ضعف کہ جینا وبال تھا!
پسماندگانِ ختمِ رسُل کا یہ حال تھا!

مرتے ہیں سب حسینؑ سا مرنا کسے نصیب
گھر بار راہِ حق میں لُٹایا زہے نصیب
شمر و یزید کے تھے مگر کیا بُرے نصیب
ہے لوحِ آسماں پہ لکھا واہ رے نصیب

وُہ بانیانِ ظُلم تو ناپید ہو گئے!
مر کر حسینؑ زندۂ جاوید ہو گئے!

شہادتِ حضرت علی اکبرؑ

ابنِ

حضرت امام حسین علیہ السّلام

وہ مردِ راہِ مہر و وفا حضرتِ خلیلؑ
حاصل ہے انبیاء میں جنہیں رتبۂ جلیل
قربانیاں ہیں جن کی زمانے میں بے عدیل
عید الضحٰے ہے جن کی بزرگی کی اِک دلیل
لیتے ہیں جن کا نام بہ صد احترام ہم
پڑھتے ہیں جن پہ روز درود و سلام ہم

کیا دیکھتے ہیں خواب میں اِک رات ناگہاں
بیٹے کی شاہ رگ پہ ہے اُن کی چھری رواں
حیرت تھی کیا ہے راز یہ سر بستہ و نہاں
تھے سر فگندہ صرفِ صد اندیشہ و گماں
آئی ندا کہ حُسن طلب گارِ عشق ہے!
خونِ شہید رونقِ بازارِ عشق ہے!

نورِ نظر سے جا کے کہا ماجرائے خواب
سنتے ہی سر بہ سجدہ ہُوا فخرِ اُمم و باب
پھر سر کو پیش کر کے کہا کیا ہے پیچ و تاب
اللہ رے نصیب مرے بختِ کامیاب
مانگو دعا کہ نذرِ محقّر قبُول ہو!
اُس بارگاہِ پاک میں یہ سر قبُول ہو!

راہِ طلب میں عاشقِ صادق کو کیا گزند
اللہ رے وہ باپ وہ فرزندِ ارجمند
بیٹے کے ہاتھ باندھ دیئے مثلِ گوسفند
خنجر کو لے کے ہاتھ میں آنکھوں کو کرکے بند
تیّار ہو گئے نہ رہِ امتثالِ امر
بندے کی کیا مجال ہے جب ہو سوالِ امر
آئی ندا تمہاری عقیدت ہوئی قبول
پرکھے گئے عیارِ محبّت پہ دو رسول
قیمت بہت بڑی تھی مگر ہو گئی وصول
ہوتا ہے تم پہ رحمتِ باری کا اب نزول
حسنِ ازل شہید سے پھر ہمکنار ہے
پھر عشق سُرخ رُو ہے ہوس شرمسار ہے

یہ داستانِ عشق نہیں ماجرائے دوش
قرباں گہِ وفا کو یہ جانبازِ سرفروش
یونہی سمجھتے آئے ہیں اِک بزمِ ناؤنوش!
منزل یہ ہے وہ جس میں نہیں جائے صبر و ہوش
وارفتگانِ افسر و دیہیم اور ہیں
یہ کشتگانِ خنجرِ تسلیم اور ہیں

جب دشتِ کربلا میں ہوئی ترکتازِ کفر
یعنی پئے ہزیمتِ حق سازبازِ کفر
روشن ہوئے سرشتِ امامت پہ رازِ کفر
دیکھا کہ حق پرست ہیں خود کارسازِ کفر
جب دینِ حق پہ غلبۂ کفّار ہو گیا
ایمان سر کٹانے پہ تیّار ہو گیا

مومن اب آنکھ کھول کے ایماں کی آن دیکھ
اِسلام کے فدائیوں کی آن بان دیکھ
کِس طرح سرفروش چھڑکتے ہیں جان دیکھ
دیکھا پیمبری کو، اِمامت کی شان دیکھ
ایک ایک کر کے کٹ گئے آلِ عبأ کے سر
دیکھا کئے حسینؑ یہ سب کچھ جھکا کے سر

اکبرؑ نے عرض کی کہ رفیق اب نپٹ چکے
مردانِ کارزار جو تھے ساتھ، کٹ چکے
آلِ عبأ کے خون سے میدان اَٹ چکے
مَیں جانتا ہوں جنگ کے پانسے پلٹ چکے
اکبرؑ بھی منتظر ہے پدر کے جواب کا
کیا حکم ہے حضورِ امامتؑ مآب کا

کہنے لگے حسینؑ کہ بیٹا بڑھو بڑھو
دلدار کو ہے سر کا تقاضا بڑھو بڑھو
ساماں ایسے کب ہوں مہیا بڑھو بڑھو
پھر جشن کب ہو گرم تماشا بڑھو بڑھو
اس وقت دل کو اپنے کہاں صبر و ہوش ہے
میدانِ عشق منتظرِ سر فروش ہے
دستورِ ہاشمیؓ ہے کہ رکتے نہیں قدم
جو منہ سے کہہ چکے ہیں وہ گویا ہے اک قسم
دم عشق کا بھریں گے جہاں تک ہے دم میں دم
میدانِ جنگ سر نہ ہوا ور ہار جائیں ہم
روزِ نبردِ عشق کی دنیا میں عید ہے
نورِ نظر بڑھو کہ یہ ساعت سعید ہے

سُن کر یہ حکم بڑھ گئے اکبر بہ عزمِ جنگ
آنکھوں میں خشم، دل میں محبت کی اک ترنگ
ہیبت کو اُن کی دیکھ کے چشمِ فلک تھی دنگ
اِک شور تھا کہ حیدرؑ کرّار ہے دبنگ
پھر زندہ ہو کے بر سرِ پیکار ہو گئے
آلِ نبیؐ کی فوج کے سالار ہو گئے

کوندے مثالِ رعد، عدو کی سپاہ پر
جس طرح برق آ کے گرے مُشتِ کاہ پر
پردے اُدھر پڑے تھے کچھ ایسے نگاہ پر
آنا نہ تھا نہ آئے ہدایت کی راہ پر
مُشکل ہے ارتباطِ حسینؑ و یزید کا
دونوں میں فاصلہ ہے ازل سے بعید کا

دل کو حریفِ غالب تیغِ جفا کیے
اکبرؑ جنودِ کفر سے تنہا لڑا کیے
سینے کے زخم تیروں سے چھلنی ہوا کیے
کیا کیا ستم یزید نے اُن پر روا کیے
لیکن قدم حسینؑ کا بڑھ کر نہ رُک سکا
شیروں کا شیر کفر کے آگے نہ جھک سکا

اے کربلا ازل سے ملے کیا تجھے نصیب
دشمن کو بھی خدا نہ دے ایسے بُرے نصیب
بے برگ بے شجر ہے تو، بدبخت بے نصیب
لیکن اِدھر تو دیکھ، ترے کھُل گئے نصیب
سینچی گئی ہے گریۂ آلِ عباؑ سے تو
رنگیں ہے خونِ عترتِ خیرالوریٰؐ سے تو

شہادتِ حضرت علی اصغرؑ

ابنِ

حضرت امام حسین علیہ السّلام

دُنیا پہ ہوتے آئے ہیں ظلم و ستم بہت
انسان نے سہے ہیں زمانے کے غم بہت
قلبِ بشر رہا ہے رہینِ الم بہت
پُشتِ جہاں رہی ہے مصائب سے خم بہت
لیکن حدیثِ معرکۂ کربلا نہ پُوچھ
اندازۂ مصیبتِ آلِ عبا نہ پُوچھ

کیونکر رقم ہو قصۂ درد و غمِ حسینؑ
وہ سرگزشتِ گریۂ چشمِ نمِ حسینؑ
رودادِ بے نوائیِ کیف و کمِ حسینؑ
ہر چند ہے ورائے بیاں ماتمِ حسینؑ
جی چاہتا ہے کچھ تو سپردِ قلم کروں
اس داستانِ مہر و وفا کو رقم کروں

تھا دشتِ کربلا میں قیامت کا سامنا
حق کی شکستِ کفر کی نصرت کا سامنا
اک اک قدم پہ اک نئی آفت کا سامنا
دن رات ایک طرفہ مصیبت کا سامنا
قتلِ امام امتِ ناداں کے ہاتھ سے
آلِ نبیؐ پہ ظلم مسلماں کے ہاتھ سے

اب ٹھن چکی تھی کفر سے صدق و صفا کی جنگ
بد عہد سے امینِ پیامِ خدا کی جنگ
گم کردہ رہ سے ہادیٔ راہِ ہدیٰ کی جنگ
یہ جنگِ کفر و حق بھی مگر تھی بلا کی جنگ
اِس جنگ میں شقاوتِ شیطاں تھی اِک طرف
اِک مردِ حق کی قوّتِ ایماں تھی اِک طرف

کیا پاسِ مصطفےٰ تھا شہِ خوشخصال کو
قرباں کیا حکومت و جاہ و جلال کو
دولت کو، ملک و مال کو، اہل و عیال کو
چلنے دیا نہ حاکمِ فاسق کی چال کو
شرعِ نبیؐ کی جان تھا، ایمان تھا حسینؑ
سچ ہے کہ قول و فعل میں قرآن تھا حسینؑ

اب کٹ چکے تھے قاسمؑ و عباسؑ نامدار
اور زیرِ خاک دفن تھا اکبرؑ سا شہسوار
وقفِ اَلم، رہینِ ستم عابدِؑ نزار
اصغرؑ پدر کی گود میں بیمار و بے قرار
سر چومتے تھے سینے سے اُسکو لگاتے تھے
رو رو کے اپنے لال کو لوری سناتے تھے

پھرتے تھے اپنی گود میں اُس کو لئے ہوئے
اشکوں کو جوشِ گریہ سے طوفاں کئے ہوئے
گزرے تھے تین روز جو پانی پئے ہوئے
اپنی زبان اُس کے دہن میں دیئے ہوئے
کہتے تھے صبر و ضبط ہے دستورِ ہاشمیؓ
تیری جبیں ہے آئینۂ نورِ ہاشمیؓ

بیٹا تو باغِ مرتضویؑ کا نہال ہے
ارمانِ فاطمہؑ ہے محمدؐ کا لال ہے
اُجڑے ہوئے گھرانے کا پسماندہ مال ہے
کیا ڈر ہے اصغرؑ آج اگر خورد سال ہے
اِک دن تو چاند تجھ پہ جوانی بھی آئے گی
کھیتی رسولِؐ پاک کی پھر لہلہائے گی

خود میں تو کوئی دم کا ہوں مہمان میرے لال
زین العبادؑ درد سے مضطر ہے اور نڈھال
ہے اب تو اُس کی ہستیٔ موہوم میں سوال
فارغ ہے تیری ذات نہ اندیشہ زوال
معصوم تو ہے تجھ سے عداوت نہیں کوئی
تجھ سے کسی کو وجہ شکایت نہیں کوئی

لیکن سلوکِ چرخِ ستم گار دیکھئے
اس بے نیازِ دہر کے اسرار دیکھئے
انجامِ کارِ حسرتِ بے کار دیکھئے
خونِ اُمیدِ سرورِ لاچار دیکھئے

اِک تیر آکے گردنِ اصغرؑ میں گڑ گیا
کہرام اہلِ بیتِ پیمبرؐ میں پڑ گیا

اِس منظرِ مُہیب کو کیسے بیاں کروں
اصغرؑ کی لاش گود میں غلطاں بہ اشکِ خوں
طوفانِ صبر و جبر سے دل چاک، سرنگوں
چشمانِ تر سے شعلہ فگن آتشِ دروں

یوُں سوئے خیمہ سیّدِ خیرُ الاُمَم چلے!
طوفان جیسے تھم کے چلے اور کم چلے!

زینبؑ نے اپنی گود میں اصغرؑ کو لے لیا
اللہ کے حضور سرِ عجز خم کیا
کہنے لگیں بہ فخر کہ اے ذاتِ کبریا
لے آج اپنے فرض کو ہم کر چکے ادا
سب کچھ تری جناب میں ہم نذر کر چکے
صد شکر امتحان میں پورے اُتر چکے

کیا کہیئے ان جفاؤں کی افتاد ہائے ہائے
معصوم پر یہ ظلم یہ بیداد ہائے ہائے
اب کس سے جا کے کیجئے فریاد ہائے ہائے
کچھ جانتے ہیں صاحبِ اولاد ہائے ہائے
گزریں دلِ حسینؑ پہ کتنی قیامتیں
محشر میں بھی تو ہوں گی نہ اتنی قیامتیں

سلام

سلام اُس پر، لکھا تھا جس کی قسمت میں ولیؑ ہونا
ازل سے واقفِ رمزِ جلی، سرِّ خفی ہونا

یہ گھر وُہ تھا کہ صدیوں سے امامت اِس پہ نازاں تھی
یہاں اِک کھیل تھا بچّوں کا، نبیوںؑ کا وصیؑ ہونا

فلک بدلے ہزاروں رنگ، لیکن اب کِسے زیبا
امیری میں فقیری، اور فقیری میں غنی ہونا

یہ دو چیزیں ازل سے ایک ہی پرتو کے جلوے ہیں
خُدا کا نور ہونا اور اولادِ نبیؐ ہونا

خدا کی دین ہے جس کو وہ دے اور جو وہ چاہے دے
بہت مشکل ہے لیکن اب حسینؑ ابنِ علیؑ ہونا

تخیّلات

بیوی

بیوی بن جانے کے بعد عورت اپنی دلچسپی، اپنی قیمت، اپنی اہمیت، کھو دیتی ہے۔ وہ مرد کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ شوہر جس وقت اور جس حالت میں چاہے، اُسے دیکھ سکتا ہے۔ اس میں وہ سحر آلود کشش نہیں رہتی جو صرف اُن چیزوں میں ہوتی ہے۔ جو حاصل نہیں ہو سکتیں یا جن کے حاصل کرنے کے لئے کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد ایک ایسی عورت میں، جو اس کی بیوی نہ ہو اپنے تقاضاتِ شوق، اپنے جذباتِ نفس سے مجبور ہو کر ہر روز، ہر ساعت نئے نئے حُسن تلاش کرتا ہے، اس کے حصول کیلئے اپنی خوابیدہ

طاقتیں بیدار کرتا ہے۔ اس کی ذراسی توجہ، اس کی ایک نظر، اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اپنے جسم و روح کے تمام امکانات ظاہر کرتا ہے۔ مگر شادی کے بعد عورت خود مرد کی آرزومند ہوتی ہے۔ یہ اس کی دلفریبی کی موت ہے۔ وہ جس قدر اچھی بیوی ہو اسی قدر کم دلکش ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ صحبتِ مستقل عورت کا حُسن چھین لیتی ہے۔ جو مزے وصل کے بعد فراق میں اور تکمیلِ آرزو کے بعد حسرت و ارمان میں ہوتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں۔ ہر نیا دن ایک گزرے ہوئے دن کی نقل ہو جاتا ہے۔ ہر نئی گفتگو ایک سنی ہوئی داستان سے زیادہ موثر نہیں ہوتی۔ شادی کے بعد عورت وہ عورت ہی نہیں رہتی، جو وہ شادی سے پہلے ہوتی ہے۔

قسمت

قسمت ایک جھوٹ ہے، جو انسان عادتاً بولتا ہے۔ قسمت ایک فریب ہے۔ جس سے غریب اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔

نیکی اور بدی

کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہ بُرا بنا سکتا ہے، نہ اچھا۔ اچھّی سے اچھّی چیز ایک بُرے آدمی کے ہاتھ میں بُری، اور بُری سے بُری چیز ایک اچھّے آدمی کے ہاتھ میں اچھّی ہو جاتی ہے۔ ایک انسان زیادہ سے زیادہ فقط یہی کر سکتا ہے، کہ کسی دوسرے انسان کے اُن فطری رُجحانات کو ایک مادّی صورت میں منتقل کر دے جنہیں متشکّل کرنے کی وہ خود جرأت نہیں کر سکتا کمزور لوگ اپنی شکست کی تلخی مٹانے اور اپنے آپ کو اپنے اعمال کی سزا سے بچانے کے لئے دوسروں کی ترغیب کو اپنی بدکاریوں کا بہانہ بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ایسا کرنے سے وہ اخلاق کی پستی، انسانیت کی ناشائستگی اور فطرت کی رذالت کا سب سے بڑا ثبوت بن جاتے ہیں۔

وقت

وقت کی تعیین زندگی کی دلچسپیوں کو مٹا دیتی ہے۔

جوانی

ایک دن جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔ جب ان روشن آنکھوں کی جگہ مرجھائی ہوئی بے نور آنکھیں، ان جوانی کے خون سے خوش رنگ گالوں کی جگہ جھرّیوں سے بھرے ہوئے بے رنگ گال ہوں گے۔ جب ایک بے لطف زندگی کی یاد، ایک داغ ناتمام کی حسرت، تمہارے چہرے کی خوبصورت سطح پر سیاہ اور گہری لکیریں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔ جب اور صرف جب ہی تم اس ایک دفعہ کھو جانے کے بعد کبھی نہ ہاتھ آنے والی دولت کی حقیقت سمجھو گے۔ سونے چاندی کے سکّے دنیا کی بہت سی آسائشیں خرید سکتے ہیں۔ مگر جن عجیب مسرّتوں کو تمہاری جوانی خرید سکتی ہے کوئی دولت، کوئی طاقت نہیں خرید سکتی۔ زندگی کیا ہے، صرف جوانی کا ایک عام فہم نام ہے کیا بچّوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے کیا بوڑھے انسان بھی زندہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ جوانی کا زمانہ، جو صرف ایک بار آتا ہے۔ وہ مختصر سی بہار جو انسان کی حیات کو ایک ذرا سے وقت کے لئے پُرکیف بنا

دیتی ہے، زندگی کا زمانہ ہے۔ رات کے تاریک اور بھیانک سائے زائل کرنے کے لئے سورج پھر نکل آتا ہے۔ خزاں رسیدہ پتّوں، مرجھائی ہوئی شاخوں کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے بہار پھر آجاتی ہے۔ مگر بڑھاپے میں انسان کا پژمردہ حسن پھر تر و تازہ کرنے کے لئے جوانی نہیں آتی۔ آہ! کبھی نہیں آتی۔

غریبی

فطرت کی بے ترتیب اور بے اصول کارفرمائیوں کی بدولت جن کو لوگ سوٗ اتفاق، بدنصیبی یا اسی قسم کے دوسرے بے معنی ناموں سے پکارتے ہیں۔ کچھ لڑکیاں ایسے غریب ماں باپ کے گھروں میں پیدا ہوتی ہیں جو غریبی کا دار رو کنے کے لئے ان معصوم بچیّوں کو اپنی سپر بنا لیتے ہیں۔ اور سونے چاندی کے چند بے حقیقت ٹکڑوں کے عوض اپنی سب سے بڑی دولت انسانی زندگی کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ آہ! انسان کی ہوس کاریوں کا جھوٹا محل کتنے انسانی حقوق کی برباد قبروں پر تعمیر ہوتا ہے

دوست

مہلک سے مہلک زہر میں وہ اثر نہیں ہوتا جو ایک برے ہم جلیس کی باتوں میں ہو سکتا ہے، ایک بد مشرب دوست اپنے ناپاک خیالات، محض اتفاقی مجبوریوں کی بنا پر بیان کرتا ہے۔ یہ خیالات میٹھے زہر کی طرح سُننے والے کی رگ و پے میں سرایت کرتے ہیں۔ اس کے دماغ میں جاگزیں ہو جاتے ہیں اور پھر ایک نامعلوم طریق سے اس کے جسم و روح میں جذب ہو کر اس کی قوتِ فعالیہ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

آئینہ

کنواری لڑکیوں کو اپنی شبِ عروسی سے پہلے آئینہ دیکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ تاکہ ان کا حسن اپنی طاقت کے نشے سے غیر متاثر، اپنی ماہیت سے بے خبر رہ کر مردوں کی پُرسکون زندگی کو بربادی اور ان کے گھروں کو ویرانی سے محفوظ رہنے دے۔

بداعتدالی

بداعتدال وہ شخص ہے۔ جس نے قوائے جسمانی کی سب سے بڑی عشرت کو ایک مہیب بدی بنا دیا۔ جس نے اپنے حواس کے مطالبے کو عقل کی حکمرانی سے آزاد کر کے اعتدال سے نا آشنا کر دیا۔ جس نے اپنے نفس کو مار کر روح کی بیماریوں کا علاج نہ کیا۔ اور روح کی معصوم آسودگیوں کو گناہ کی خوفناک ہوس کاریوں میں تبدیل کر دیا ——

کل

میرے لئے کل، آج کی صبح کے طلوع ہوتے ہی ختم ہو گیا۔ تم مجھے 'کل' کی یاد دلا کر ابھی تک ایک گزرے ہوئے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہو۔ اور مجھے بھی مجبور کرتے ہو کہ میں آج کی زندگی کو 'کل' کی موت کا مرثیہ لکھنے میں صرف کر دوں۔ میرے 'کل' کو ماضی کے مہیب اور وسیع قبرستان کے کسی تاریک اور گمنام گوشے کی بکھری ہوئی خاک میں تلاش کرو۔

جھوٹ

کیا تم عورت کے سامنے سچ بولنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہے، تو تم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں۔ سنو عورت صرف جھوٹ پسند کرتی ہے۔ سچائی میں عورت کے مصنوعی احساسات کو منعکس کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں۔

پسند اور محبّت

محبّت ایک جذبہ ہے بالکل فوری، اضطراری اور غیر اختیاری وہ ایک ہی نظر میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محبّت جو آہستہ آہستہ ترقی کر کے مدارج صعود طے کرے یا جو صرف اس لئے معرض وجود میں آجائے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کی زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے محبّت نہیں پسند ہے۔ لوگ پسند اور محبّت میں اسی طرح تمیز نہیں کرتے، جس طرح دوستی اور رغبت میں، یا پرستش اور عزّت میں

عشق

لوگ اِس مفید اور کارآمد دنیا کے مشاغل سے غافل ہو کر، ایک بے معنی تخیل، ایک بے حقیقت تمسخر کی تشکیل کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں۔

عشق نہ صرف ایک بے معنی لفظ ہے، بلکہ ایک جھوٹ ہے جسے انسان عادتاً بولتا ہے۔ ایک فریب ہے۔ جس میں بیکار لوگ اپنے آپ کو مبتلا کر لیتے ہیں، ایک مرض ہے۔ جو کبھی کبھی کمزور دماغوں کو لاحق ہو جاتا ہے

محرمِ راز

مجھے ایک محرمِ راز کی ضرورت ہے جو میری خوشی سے خوش ہو اور میرے غم سے مغموم ہو، جو میری خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرے۔ میرے منجمد دل کو محبت کی آگ سے گداز کرے اور خود اس محبت کا آئینہ بن کر میری زندگی کو ایک سچی مسرت سے مسرور کر دے

زندگی

جو شخص ایک ہی رائے پر قائم اور ایک ہی اصول پر کاربند رہتا ہے، وہ مردہ ہے۔ زندگی تغیّر کا ایک دوسرا نام ہے۔ ہر نیا تجربہ، ہر نیا علم، انسان کی اندرونی کیفیات میں ایک تغیّر پیدا کر دیتا ہے۔ اور ایسے ہر تغیّر کے بعد انسان کی ایک نئی پیدائش کا آغاز ہوتا ہے، نافہم انسان تغیّر سے ڈرتے ہیں اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔

مرد

سچّے معنوں میں مرد وُہ ہے۔ جو عورت کی محبّت کو حسَب و نسَب کے امتیازات سے جیتنا نہیں چاہتا۔ وہ اس عورت کو جسے وہ عمر بھر کے لئے اپنے رنج و راحت کا شریک بنانا چاہتا ہے۔ اپنی دولتمندی اور خوشحالی کا لالچ بھی نہیں دیتا کہ یہ سب چیزیں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اس کی خواہش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ عورت اُسے اُس کے ذاتی اوصاف کے باعث اپنے انتخاب کی عزت بخشے۔

عورت

عورت اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے وقت، سہولت اور مقام کی تلاش نہیں کرتی۔ جس طرح محض قدرت کی طرف سے کسی خاص جڑی بوٹی میں اکسیر کا اثر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح عورت کے ہاتھ میں ایک مسیحائی اثر ہے۔ اس کا ذرا سا اشارہ، اس کا ہلکا سا سہارا، برسوں کی تکلیف اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے، دُکھے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی، قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہے

وفاداری

وفاداری، ایک مفلس طبیعت کا سرمایہ ہے۔ محبّت بے شک ایک ناقابلِ تغیّر جذبہ ہے۔ مگر اس جذبے کی زندگی برقرار اور اُس کی یکسانیت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مقصد، اس کا مدعا، اس کا میدانِ عمل تبدیل ہوتا رہے

مقدّس چیزیں

جس چیز سے محبّت کی جائے، وہ یقیناً خوبصورت نظر آتی ہے ہر خوبصورت چیز کو مقدس سمجھنا چاہیئے۔ مقدس چیزوں کو لوگ ہاتھ نہیں لگاتے، دُور سے دیکھتے ہیں، شاید ان کو دیکھنا بھی خلافِ ادب ہے۔

عاشق اور معشوق میں بُعدِ مکانی ضروری ہے، تاکہ وہ رُوحانی ارتباط، وہ بہتی تسلسل، جو اجسام کے وصال میں ناممکن ہے، قائم ہو سکے۔ چھونے سے مقدّس اشیاء کی پاکیزگی فنا ہو جاتی ہے، ان کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ محبّت مقامِ پرستش کی ایک منزل ہے۔ مقدس اشیاء سے مادی مفاد کی اُمید درست نہیں، کیا ایک مفید اور کارآمد چیز سے بھی کوئی شریف اور خوش مذاق انسان محبّت کر سکتا ہے؟

عشق

بُلبل پھول کی بکھری ہوئی، مرجھائی ہوئی پامال پتّیوں میں بھی پھول کو پہچان لیتی ہے۔ عشق حُسن سے کسی زیادہ پائدار چیز کا نام ہے

شبِ وصل

یہ وہی رات ہے جس کی آرزو کی خاکستر میں ہزاروں عشّاق دفن ہو گئے۔

یہ وہی رات ہے جس کے حصول کی تمنا عشق کی تربیت کا موجب ہوتی ہے۔

یہ وہی رات ہے جس کے قرب کا شوق کڑی سے کڑی منزل کو آنِ واحد میں طے اور مشکل سے مشکل مہم کو ایک اشارے میں سر کر لیتا ہے۔

یہ وہی رات ہے جس کی امید زندگی کی تلخیوں کو شیریں، دردِ ہجر کی مصیبتوں کو خوبصورت، شوق کی ناکامیوں کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔

یہ وہی رات ہے جو قانون کی پابندیوں کے ساتھ، قدرت کا بہترین تحفہ ایک مرد کی محبّت کا خوشترین ثمر، ارتباطِ جسمانی کا بلند ترین عروج ہے۔

یہ وہی رات ہے جو حکمِ جواز کے بغیر شیطان کا سب سے مہیب آلہ، اخلاقی ذلّت کی سب سے اسفل گہرائی، عورت اور مرد کی فطری کمزوری کی سب سے روشن دلیل ہے

انتقام

انتقام ایک فطری تقاضا ہے جو شخصی اور مقامی تعیّنات سے بے نیاز ہے۔

مظلوم صرف ظالم ہی سے نہیں، ظالم کی جنس کے ہر فرد سے ظلم کا انتقام لیتا ہے۔

آگ جب بھڑک اُٹھتی ہے تو دوست اور دشمن کے گھر کی تمیز نہیں کرتی۔

انتقام کا جذبہ بھی ایک آگ ہے اور یہ آگ بھی آگ ہی کی طرح اندھی ہے۔

میدانِ جنگ میں دُشمنوں کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ نہیں اُتارتے۔

ہتھیار

حُسن اور جوانی غربی سے لڑنے کے لئے مضبوط ہتھیار ہیں

پردہ

اگر اخلاقِ حسنہ کی بنیاد محض تقلید۔ کسی گناہ کے ارتکاب کی ناقابلیت یا اس کے وسائل کے فقدان پر منحصر ہے تو وہ کوئی نیکی نہیں۔

پردہ اگر محض ایک رسم کی پابندی ہے۔ اگر پردے میں رہ کر عورتیں صرف گناہ کے ارتکاب کے امکانات اور اس کے وسائل سے محروم ہو جاتی ہیں تو پردہ صرف بزدلی اور کمزوری کا ایک معزّز نام ہے۔

عصمت اس سے بہت زیادہ قوی اور مضبوط وصف ہے۔

پردہ عورت کی عصمت کو بچانے کے لئے نہیں اُسے ناپاک نگاہوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔

عورت کی پاکیزگی کو اجنبی مردوں کی نگاہ بھی ناپاک کر دیتی ہے۔

عورت اپنی ابتدا اور انتہا میں ماں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ماں کی پرستش عبادت ہے۔

پجاری کا فرض ہے کہ اپنے معبود کو گستاخ نگاہوں سے بچائے۔ یہی اسکی سب سے بڑی عبادت ہے۔ پردہ اسی عبادت کا ایک عام فہم نام ہے۔

دُنیا

یہ دُنیا ایک مشکل معمّہ ہے، دنیا والے کس قدر کوشش سے اِسے اور مشکل بناتے چلے جاتے ہیں۔

کوئی شخص یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اس کی حقیقت اپنے اصلی رنگ روپ میں کسی پر ظاہر ہو۔

اکثر انسان سیدھی سادی باتوں میں بڑے بڑے مشکل اور گہرے مطالب تلاش کرنے کی فکر میں سرگرم رہتے ہیں۔

بہت لوگ ایسے بھی ہیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ان کو فریب نہ دے تو وہ خود اپنے آپ کو کسی نہ کسی فریب میں مبتلا کر لیتے ہیں۔

انسان زہر کھانا پسند کرتا ہے۔ اگر زہر نہ مل سکے تو تریاق ہی کو زہر سمجھ کر کھاتا ہے

طاقت

اگر اپنے پاس طاقت نہیں، تو تم اُسے خرید سکتے ہو۔

تقسیمِ عمل

تقسیمِ عمل قانونِ قدرت کا ایک اہم فعل ہے۔ ہر فعل اُس کے فاعل کی صلاحیّت اور اس کی مقدرت کے متوازن ہوتا ہے۔

کوئی عمل اتنا وقیع نہیں کہ اس کا عامل اپنی تقدیر پر نازاں ہو۔

کوئی عمل اتنا سفیہ نہیں کہ اس کا عامل اپنی قسمت سے محجوب ہو۔

اِس کائنات کا انصرام ایک عظیم الشان عمل ہے۔ اِس میں چمکتے ہوئے سورج کو بھی ایک مقام حاصل ہے، اور مٹی کے تاریک ذرّے کو بھی ایک مقام حاصل ہے۔ شرط یہ ہے کہ سورج بھی اور ذرّہ بھی اپنا اپنا کام دیانت، تن دہی اور استقلال سے کریں۔

مزدور! اگر تیری پیشانی محنت سے اُسی طرح شکن آلود ہے، جس طرح بادشاہ کی پیشانی رعایا کے فکر سے شکن آلود ہے۔ اور اگر تیری کمر بارِ مشقت سے اُسی طرح خم ہے، جس طرح بادشاہ کی کمر سلطنت کی ذمّہ داریوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے تو تم دونو دیانتدار انسان ہو۔ پھر تُو اپنی قسمت پر کیوں شرمسار ہے۔

عظمت

بادشاہ کے دربار میں وزیر اور دربان کا ایک رتبہ ہے، بلکہ دربار کی شان برقرار رکھنے کے لئے دربان وزیر سے زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔

فرائض کی نوعیّت، فرائض انجام دینے والوں کی شخصیت اور حیثیت کو تبدیل نہیں کرتی۔ ایک تصویر کی تکمیل کیلئے چھوٹے سے چھوٹا خط، ضروری سے ضروری خط و خال سے کم اہمیّت نہیں رکھتا۔

وہ تصویر جس کا نام کائنات ہے۔ اس میں بادشاہ اور مزدور دونو کا رتبہ برابر ہے۔ دونو میں سے کسی ایک کے بغیر تصویر مکمّل نہیں۔

وہ ساز جس کا نام ہستی ہے۔ اس میں زمزمۂ شادی اور نوحۂ غم دونو کا رتبہ ایک ہے۔ دونو میں سے کسی ایک کے بغیر نغمہ مکمّل نہیں۔

تعجب ہے۔ اس دنیا میں غریب اپنے آپ کو کیوں اس قدر بے حقیقت، اور امیر اپنے آپ کو کیوں اس قدر اہم سمجھتے ہیں۔

آنسو

دُنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں۔ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔
انسان کا ہر فعل، اُسکی ہر حرکت، اس کی زبان سے نکلا ہوُا ہر لفظ، اس کے جذبات کا ہر اظہار ایک کار آمد چیز ہے۔ ایک غیر فانی حقیقت ہے۔

ہر فعل کی اہمیّت اس کے نتیجے میں منعکس ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ میں ایک بہادر سپاہی کی تلوار کی ضرب، سیاسی ریشہ دوانیوں میں ایک ماہرِ سیاسیات کی تدبیر، عالمِ تجربہ و تقریبہ میں ایک عالمِ نفسیات کا شاہکار اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور وقیع ہیں۔ مگر وہ آنسو بھی جو ایک دلِ شکستہ مہجور کی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔ عالمِ حسّیات میں اسی قدر اہم اور وقیع ہے۔
کیا فطرتِ انسانی کے اتھاہ سمندر کی سطح سے چھلکا ہوُا ایک حباب بھی کوئی بے مایہ چیز ہے؟
سینے کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے، دل کے ایک غیر مرئی جذبے کی تشکیل و تعیین فطرت کا ایک نادر شاہکار ہے

ضمیر

ضمیر ایک آواز ہے جو ارتکاب گناہ سے پہلے انسان کے دماغ سے، یا دل سے، یا اس کے روئیں روئیں سے نکلتی ہے اور اس کے متحرک جسم کو ایک لمحے کے لئے ساکن کر دیتی ہے۔

انسان کی فطری نیکی اپنی موت سے پہلے زندگی کے لئے جو آخری کشمکش کرتی ہے۔ اخلاق اپنے وقار کی حفاظت کے لئے جو آخری تدبیر کرتا ہے۔ حواس اپنی صحت کا جو آخری ثبوت دیتے ہیں۔ اسی کو ضمیر کہتے ہیں۔

گناہ جب خیال کی دنیا میں پیدا ہو کر عمل کی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے تو مجروح شرافت آخری سانس لیتی ہے انسان کے نظامِ عصبی اور قوائے جسمانی میں ایک بھونچال سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس کے دماغ کی سلطنت میں بغاوت ہو جاتی ہے۔ ضمیر اسی بغاوت کا اظہار ہے۔ انسان ضمیر کی آواز سنتا ہے، ضمیر کی موجودگی محسوس کرتا ہے۔ مگر اپنی آنکھوں پر حرص و آز کی پٹی باندھ کر اپنے کانوں میں ہوس

کا پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر گناہ کے آہنی پنجے سے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتا ہے

علم

جوانی کو صرف گناہ کی سحر آفرینیوں سے آگاہ کرنا ایک غلطی ہے

جوانی کو محض گناہ کی ہلاکت انگیزیوں سے ڈرانا بھی ایک غلطی ہے

علم حقیقت میں ہر چیز کے حسن و قبح سے واقف ہونے اور ان کو کسی معیّن معیار پر پرکھنے کے حق کو کہتے ہیں۔

لاعلمی نہ حسن سے واقف ہے نہ قبح سے، وہ ایک رضائے مجبور ہے، ایک میلانِ بے عنان۔

عالم نیکی سے محبّت کرتا ہے، اور بدی سے نفرت۔

جاہل نہ نیکی سے محبّت کرتا ہے نہ بدی سے نفرت۔

عالم کی بدی بھی نیکی کا سرچشمہ ہے۔

جاہل کی نیکی بھی بدی کی سدِّ راہ نہیں۔

علم شئے بہ از جہل شئے

اختلاف

ایک انسان اور دوسرے انسان میں اختلاف قومی، مذہبی اور ملکی بنا پر نہیں، بلکہ اُن کی فطرت کے میلان اور اُن کے تمدّن کے معیار کی بنا پر ہوتا ہے۔

بسا اوقات ایک ہی ملک کے رہنے والے، ایک ہی مذہب پر ایمان رکھنے والے، ایک ہی قوم کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر نہیں رہ سکتے۔ وہ اپنی صحبت کے لئے ایک ایسا ہم جنس چاہتے ہیں جو اُن کے طبعی میلانات اور فطری رجحانات کو سمجھنے اور اُن کی قدر کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہو۔ اور جب انہیں کوئی ایسا ہم جنس مل جاتا ہے تو وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس کا تعلق کس ملک، مذہب یا قوم سے ہے۔

تعجب ہے۔ ازدواج کو جو حقیقت میں ایک دائمی رفاقت اور جاودانی صحبت کا رشتہ ہے اس اصل الاصول سے بے نیاز اور آزاد کر دیا گیا ہے۔ ہر اپنی رفیقۂ حیات صرف اپنے ہی مذہب، اپنی ہی قوم،

اپنے ہی ملک اور اکثر اپنی ہی ذات اور برادری کے لوگوں میں تلاش کرتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس انتخاب میں باہمی ارتباط کے وہ ضروری عناصر بھی موجود ہیں یا نہیں جو زندگی کے ساز میں ایک نغمہ پیدا کر سکیں۔ بہت سی شادیوں کا حسرتناک انجام اسی بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی رسموں کی پابندی اس دنیا کے مجلسی نظام میں ایک ضبط پیدا کر سکتی ہے۔ مگر وہ مختلف النّوع فطرتوں میں ربط پیدا نہیں کر سکتی

پشیمانی

گناہ کے ارتکاب کے بعد اس کی یاد ایک مہیب سزا ہے۔

پشیمانی میں مہیب سے مہیب سزا کے اوصاف موجود ہیں۔

جسمانی سزا جسم کو تکلیف اور دکھ میں مبتلا کر کے انسان کی روح کو گناہ کی آلائش سے پاک کرتی ہے۔

پشیمانی اور ندامت کے آنسو روح کو تکلیف اور دکھ میں مبتلا کر کے انسان کے جسم کو گناہ کی آلائش سے پاک کر دیتے ہیں

خوف

انسان کو بدی سے بچانے اور نیکی کی طرف راغب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ خوف ہے۔ انسان کے وضع کئے ہوئے قوانین اور مذہب کی تجویز کی ہوئی سزائیں اسی خوف کی محرّک ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ انسانی قوانین جسم کو دُکھ دیتے ہیں اور مذہب کے قوانین روح کو اذیّت پہنچاتے ہیں۔

نتیجہ دونو کا ایک ہے مگر شرط یہ ہے کہ انسان کی فطرت نیک ہو۔

اگر فطرت نیک نہیں تو اِس دنیا کا قید خانہ اور اُس دنیا کا جہنّم انسان کے دل میں خوف پیدا کرنے کی صلاحیّت نہیں رکھتے۔

جس دل میں خوف نہیں، وہ بدی کا گہوارہ ہے۔

عیوب

اگر تم چاہتے ہو۔ کہ تم اپنے آپ کو پہچانو، اور تم پر اپنا حسن ظاہر ہو، تو اپنے عیوب کا مطالعہ کرو۔ وہی تمہاری دلکش خصوصیات ہیں۔

جُرم

کِسی جُرم کا ارتکاب دو قسم کے انسان کرتے ہیں۔ ایک وہ جو اِس کی اہمیّت اور وقعت سے واقف ہوں، دوسرے وہ جن کو اُس کی تباہ کاریوں کا احساس نہ ہو۔

عِلم، جرائم کا اسی قدر ذمّہ دار ہے جس قدر لاعلمی۔

انسان اپنے عِلم اور تجربے کی زیادتی یا اپنی کم آگاہی اور ناتجربہ کاری کے تناسب ہی سے اچھا یا بُرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

ارتقاء ایک فطری تقاضا ہے۔ وہ نیکی کی طرف ہو، یا بدی کی طرف، انسان کے طبعی رجحانات اخلاقی تعیّنات سے بے نیاز ہیں۔

بدی کے تقاضائی امکانات سے ناآشنائی، ارتکابِ جرائم کا اُسی قدر باعث ہو سکتی ہے۔ جس قدر بدی کے مہلک اثرات سے ناآگاہی۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بدی کا عِلم اور گناہگاری کا تجربہ اور پھر اِس عِلم اور تجربے کے ناگزیر نتائج انسان کو نیک بنا دیتے ہیں۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ بدی کی قابلیّت سے محرومی اور

گناہگاری کی لذّات سے ناآشنائی انسان کو بدی اور گناہ سے مجتنب رکھتی ہیں۔ پہلی قسم کے انسان نیک ہیں، دوسری قسم کے انسان معصوم۔ نیکی اور معصومی میں بڑا فرق ہے۔

ایثار

ایثار کے بغیر دوستی ایک بے معنی چیز ہے۔ تم اپنے دوست کو اپنے امکانات کی انتہائی وسعت سے بھی زیادہ فائدہ پہنچاؤ۔ اور اس سے کسی فائدے کی توقع نہ رکھو۔ یہی غیر فانی دوستی کا راز ہے۔

وقت

وقت کا مہلک ہاتھ حُسن کی طاقت کو شکست دے سکتا ہے
مگر عشق اس کی زد سے بے نیاز ہے

فنا

محبّت فنا نہیں ہوتی، صرف محبّت کرنے والوں کی زندگی فنا ہو جاتی ہے۔

مقدّس عہد

جو عورت اپنے شوہر کے رنج وغم میں شریک نہیں۔ وہ اپنی شادی کے وقت کئے ہوئے مقدس عہد کو ناپاک کرتی ہے۔ عورت اپنے شوہر کے رنج والم برداشت کرنے کے لئے فولاد سے زیادہ مضبوط، چٹان سے زیادہ پائدار، اور صبر سے زیادہ مستقل مزاج ہوتی ہے

عورت کی محبّت

محبّت کی آگ عورت کے دل میں محض ایک مرتبہ بھڑکتی ہے، اور ایک ہی مرتبہ بھڑک کر اس کا سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

بے وفائی

بے وفا مرد اپنی بے وفائی کو وقت، حالات، واقعات، تقاضات اور اسی قسم کے دوسرے ناموں سے موسوم کر لیتا ہے۔

خوشی اور غم

زندگی کی عبارت میں بھی صنعتِ تضاد ہے۔ انتہائی خوشی کے کیف میں انسان کی آنکھ سے آنسو بہ نکلتے ہیں۔ وہی آنسو جو دل کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، اور غم کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔

دین و دُنیا

انسان کے لئے دو اوصاف بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں۔

دینی امور میں احترام۔

دنیاوی معاملات میں راستبازی۔

عادت

کسی اچھّی شے کی عادت بھی بُری چیز ہے۔ ایک جابر تقدیر کے ہاتھ میں بے بس انسان نہ حالات پر قابو پا سکتا ہے اور نہ وقت کا پابند ہو سکتا ہے

بدکار عورت

وہ ستم رسیدہ عورت جسے مرد بدکار عورت کے نام سے پکارنا پسند کرتے ہیں۔ ایک مرد کے جرم کا انتقام، اس کی ساری جنس سے لیتی ہے۔ آدم کے ایک بیٹے کے گناہ کی سزا اس کی ساری اولاد کو دیتی ہے۔ عورت کی بدکاری، فطرت کے جذبۂ انتقام کا ایک غلط نام ہے

مرد کی محبت

مردوں کے لئے محبّت ایک کھیل ہے۔ عورت کا دل ایک کھلونا جب چاہا یہ کھیل کھیلا، اور جب چاہا اس مٹی کے گھروندے کو بگاڑ کر دنیا کے اہم کاموں میں مصروف ہو گئے

فتح و شکست

عورت کی محبّت انسان کی سب سے بڑی فتح، اور عورت کی نفرت انسان کی سب سے بڑی شکست ہے۔

بیوقوف

جس شخص کے قبضے میں اپنی دولت نہ ہو، صرف مفلس ہے مگر جو شخص دوسروں کی دولت کی کمزور بنیاد پر اپنی اُمیدوں کا محل تعمیر کرتا ہے مفلس بھی ہے، اور بیوقوف بھی

تحصیلِ کمال

دولت، عزت، حکومت کوئی شخص آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ گلاب کے پھول تک پہنچنے سے پہلے کانٹوں میں الجھنا پڑتا ہے۔

غریب

غریب وہ ہے، جو کمزوری کو ضمیر، سستی کو قناعت، ترقی کو ہوس کہہ کر پکارتا ہے۔ اور غریبی کو جو دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ اپنی آغوشِ محبت میں اُٹھا اُٹھا کر پالتا ہے

غلام

جب کوئی شخص اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی جگہ تمہاری آنکھوں سے دیکھے اپنی سمجھ سے کام لینے کی جگہ تمہاری سمجھ سے کام لے جب اُس کا معیار تمہاری رائے، اس کا ہر لفظ تمہارا سکھایا ہوا سبق ہو تو وہ صحیح معنوں میں تمہارا غلام ہے

غلامانہ ذہنیت

جب کسی قوم کا دماغ حاکم کے دماغ کا آئینہ، اس کا ضمیر حاکم کے ضمیر کی تصویر، اس کا اظہار حاکم کے جذبات کی زبان بن جاتا ہے تو اس قوم کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے

تسکین

جسمانی درد کے بعد دماغ بہت جلد تسکین پاتا ہے۔ طُوفان کے بعد سمندر کی سطح پر غیر معمولی سکون نظر آتا ہے

جوان عورت

فصلِ بہار کی البیلی کلی، جوانی کے سمندر کی سطح پر تیر رہی ہے۔
برکھا رُت کی چڑھی ہوئی ندّی اپنے دونو کناروں سے چھلک رہی ہے۔
مدہوش شرابی کی طرح یہ صرف آج کے نشے کو جانتی ہے، کل کے
خُمار کو نہیں پہچانتی۔

جھوٹا پیار

مرد کی محبّت ایک پایاب ندّی ہے اور عورت کی محبّت ایک
اَتھاہ ساگر، اِس لئے عورت کی محبّت پر صرف مرد کا جھوٹا پیار ہی
غالب آ سکتا ہے

کنیز

عورت ماں ہو سکتی ہے، بہن ہو سکتی ہے، بیٹی ہو سکتی ہے
بیوی ہو سکتی ہے مگر کنیز نہیں ہو سکتی۔

ہنسی

مصیبت پر ہنس دینے کے سوا غم کا کوئی علاج نہیں۔ جو لوگ مصیبت پر نہیں ہنستے، ان پر مصیبت ہنستی ہے کیا کسی طاقت پر غالب آنے کا یہ ایک کامیاب طریقہ نہیں کہ اس کی اہمیت کو کم کر دیا جائے، اس کی ہیبت کو نہ مانا جائے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا جائے۔ طاقت اِس لئے طاقت نہیں کہ اس میں ایک فوق الفطرت قوّت کے فطری خواص موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ اِس لئے ہے کہ جس پر وہ آزمائی جاتی ہے۔ اس میں ایک تحت الفطرت کمزوری کے فطری خواص موجود ہوتے ہیں۔ جذبات کی طاقت بھی ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے اور حوادث کے اثرات بھی ایک اضافی حیثیت رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ایک غالب اور مغلوب، فاتح اور مفتوح، حاکم اور محکوم قوم کی طاقت اور کمزوری محض اضافی امور ہیں

گناہ

انسانی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جب گناہ فطرتِ انسانی پر غلبہ پا کر حواس کے فطری افعال کو معطل کر دیتا ہے۔ جسم کا ایک ایک رُواں، دماغ کا ایک ایک رگ و ریشہ صرف گناہ کے مہیب جذبات کو محسوس کرنے اور انہیں عملی صورت دینے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان کی عقل اور رائے گناہ کے رنگ میں رنگی جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کی نازک عنانِ حکومت گناہ کے کرخت ہاتھوں میں دے دیتا ہے، آنکھیں گناہ کی ڈراونی صورت میں ایک عجیب حُسن تلاش کر لیتی ہیں۔ قوائے جسمانی گناہ کی مشکل اور جرأت طلب مہمّات سر کرنے کی قابلیّت محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ اخلاق کے مسلّمہ اصول، ضمیر کے رُوحانی تقاضات، نیکی کے فطری جذبات، انسانی خود رائی کو کھلی بغاوت پر آمادہ پا کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ انسان نیکی اور بدی میں تمیز کرنا بھول جاتا ہے۔ ہر وہ طاقت جو اس کو اس وقت سے پہلے بدی سے

بچاتی تھی۔ اب اسے صرف بدکاری کی طرف مائل کرنے کے لئے ایک طبعی رجحان بن جاتی ہے۔ معصومیّت کی کمزوری اس کی عصیاں کوش چیرہ دستیوں کے لئے ایک بہانہ، عفت کی بے لوث پاکیزگی اس کی سیاہ کاریوں کے لئے ایک ترغیب، نیکی کی غیر مدافعانہ روا داری اس کی ناروا دست درازیوں کے لئے ایک زندہ دعوتِ استیلاء ہو جاتی ہے یہ شوقِ گناہگاری ساعت بہ ساعت لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور جس طرح ایک خونخوار درندہ انسان کا لہو چاٹ کر اپنی ہر معمولی خوراک سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے اسی طرح گناہ کے آہنی پنجوں سے مسلّح انسان کسی بڑے گناہ کی لذّت سے آشنا ہو کر معمولی گناہوں کو بے حقیقت سمجھنے لگ جاتا ہے اور ان سے بھی زیادہ مہیب گناہوں کے ارتکاب کے لئے نئی نئی تدبیریں سوچتا ہے۔ تکمیلِ ہوس آتشِ ہوسکاری کو اور بھڑکاتی ہے۔ حواسِ انسانی اپنی کارگزاریوں سے معطّل ہو کر اپنی تمام طاقتیں اِسی ایک ہی حسِّ معصیّت انگاری میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کی تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ سینکڑوں شمشیر بکف غاصب حکمران، ہزاروں غریب کُش سُود خوار زر پرست، لاکھوں عصمت سوز ہوس پرور بدکار،

اپنے اپنے میدانِ عمل میں گناہ کی اسی روز افزوں دیوانگی سے متاثر ہو کر انسانی حقوق کی پامالی اور اخلاق کی بلند عمارت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں۔ اعمالِ انسانی کی یہ تاریخ اپنے آپ کو آج بھی اسی طرح دہرا رہی ہے اور شاید قیامت تک اِسی طرح دہراتی رہے گی۔

گناہگار

وہ گناہگار جسے گناہ کا احساس نہ ہو، نجات سے محروم ہے۔
وہ معصوم جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، نجات کا حق رکھتا ہے۔
وہ گناہگار جو گناہ سے تائب ہو جائے، نجات کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

جہنّم

اگر تم چاہتے ہو کہ اِسی دنیا میں جہنّم کی آگ میں جلو تو ایسے لوگوں سے میل جول رکھو جو تمہاری فطرت کے میلان اور تمہاری پسند کے رُجحان کو سمجھنے کی صلاحیّت نہیں رکھتے

سانپ اور بھیڑیئے

انسان کی روح کو ڈسنے والے سانپ، انسان کی عقل کا خون پینے والے بھیڑیئے، بداخلاقی کے سرمائے سے تجارت کرنے والے وہ تاجر ہیں جو دولت مند امیرزادوں کے ہمدرد، رفیق اور غمگسار بن کر اُن کو دولت لٹانے کے نئے نئے اور دلکش طریقے سکھاتے ہیں۔ گناہ کے سنہری جال کی روز بروز مضبوط ہونے والی کڑیوں میں پھنسا کر اور ہر قسم کی مذموم عادات کے تباہ کن اثرات سے کمزور کر کے اُن کو اپنے قابو میں لاتے ہیں۔ وہ مہیب اور سیاہ کار عفریت جو شہروں کی غریب آبادی کی عصمت کو سونے چاندی کا لالچ دے کر بھولی بھالی عفت کو کبھی نہ پوری ہونے والی آرزوؤں سے پھسلا کر، اندھی جوانی کو خواہشات کی وارفتگیوں سے اور اندھا بنا کر دنیا کو اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کرنے کا آلہ، شیطان کی حکومت کو وسیع اور مستحکم کرنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں اور پھر انسانیت کی اِن بلند مگر نازک عمارتوں کو گرا کر، اپنی زرپرستی کے شکاروں کو پیسے پیسے،

کوڑی کوڑی کا محتاج کرکے ان کو ایک نظر دیکھنے یا دیکھ کر پہچان لینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے۔

بدی

جب انسان بدی کے انتہائی مدارج پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنی بدکاریوں ہی کو اپنی امتیازی خصوصیّات، اپنی برائیوں ہی کو اپنی اچھّائیاں اپنی ذلّت ہی کو اپنی عظمت سمجھنے لگ جاتا ہے۔

بدنامی

بدنامی کو نیک نامی میں تبدیل کرنے کے لئے صرف عقل کی ضرورت ہے۔ اگر عقل بھی نہ ہو تو دولت دشمنوں کا منہ بند کر سکتی ہے

مفلسی

ذلّت، رسوائی، خوشامد یہ صرف مفلسی کے عام فہم نام ہیں۔

جھوٹ

لوگ جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹ سُننا پسند کرتے ہیں مگر جھوٹ کو بُرا کہتے ہیں۔

جھوٹ حقیقت میں سچائی کی برتری کی سچّی دلیل ہے۔ کامیاب جھوٹ وہی ہے جو بالکل سچ نظر آئے۔ گویا جھوٹ بولنے والوں کا منتہائے نظر سچائی کے سِوا اور کچھ نہیں۔ جو شخص اِس طرح جھوٹ نہیں بول سکتا کہ اس کا جھوٹ سچ معلوم ہو۔ وہ فن کے اعتبار سے ایک مبتدی ہے۔

جو جھوٹی بات جھوٹی دکھائی دے، وہ جھوٹ کے فطری تقاضات سے عاری ہے۔

جھوٹ ادبّیات میں صنعت اور سیاسیات میں تدبیر کے معزز نام سے پکارا جاتا ہے۔ مگر نام کی یہ تبدیلی اس کی اصلیّت میں کسی قسم کا تغیّر پیدا نہیں کرتی۔

سب سے کامیاب شاعر وہی ہے جو تخیّل کو سب سے زیادہ

خوبصورت جھوٹ بولنا سکھا سکتا ہے۔ سب سے کامیاب سیاست دان وہی ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ اور بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتا ہے۔

جھوٹ کو انسانی فطرت سے ایک ازلی مناسبت ہے بچّے جو فطرت کی معصومیّت کا سب سے بڑا مظہر ہیں۔ صرف ایک چھوٹی دُنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی نظر اور ان کا دماغ ایک ہی چیز کی ماہیّت اور ظاہری کیفیت کے متعلق ایک رائے نہیں رکھتے۔ عقلمند سے عقلمند انسان کی فطرت میں بچپن کی یہ خصوصیّت باقی رہتی ہے۔ اور عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر پُراسرار یا عقل سے بالاتر چیز پر یقین لانے کا شوق اُسی محبّت کی دلیل ہے۔ جو انسانی اعتماد کو فطرتاً جھوٹ سے ہے۔

جھوٹ پر یقین کرنا اِس قدر مشکل نہیں۔ جس قدر جھوٹ بولنا مشکل ہے۔ اِس لئے بہت سے لوگ جو شاید یہ فن ارادی طور پر اختیار کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس فن کی ترقّی میں اہلِ فن سے کم حِصّہ نہیں لیتے۔

جھوٹ بولنے کے لئے قوتِ حافظہ کی توانائی بہت ضروری ہے اور اگر یہ سچ ہے کہ قوت مشق سے نشو و نما پاتی ہے۔ تو یقیناً جھوٹ قوتِ حافظہ کی مشق کے لئے بہت وسیع امکانات رکھتا ہے۔

اربابِ فن کی رائے میں جھوٹ بولنے کے لئے یہ احتیاط لازمی ہے۔ کہ جھوٹ بولنے والا تقریر میں اختصار سے کام لے۔ کلام کی طوالت بسا اوقات انسان کی اندرونی کیفیتوں کی غمّازی کرتی ہے۔

غریبوں کا حق

وہ دولت جس سے دولت مند غریبوں کی بیٹیوں کی عصمت برباد کرتے ہیں۔ وہ عزت جو عزت داروں کو غریبوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے چھین لینا غریبوں کا حق ہے۔

اطمینانِ قلب

اطمینانِ قلب اُس جسمانی آرام کو کہتے ہیں جو صرف ایک نیک دل انسان کو ایک نیک کام کی تکمیل کے بعد میسر آتا ہے۔

انسان

انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جب وہ اپنی قوتِ حافظہ کو عملی طور پر، ایک ارادی کوشش سے بیکار کر دیتا ہے اور اندیشہ و احتیاط کو خود فراموشی کے خواب آور مرکب سے میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی عنانِ اختیار محض اتفاق کے غیر ذمّہ دار ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ اس کا کوئی خیال، اس کا کوئی لفظ، اس کا کوئی فعل اب کسی خاص مقصد کے لئے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بجائے خود ایک مقصد بن جاتا ہے۔ جو ارادے کے ساتھ ہی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ ہر نئی چیز کو دیکھ کر اس کے حصول کی خواہش سے بیقرار ہوتا، ہر خواہش کو فوراً پورا کرنے کے لئے تیار ہونا اس کے نزدیک اب زندگی کا سب سے اہم مفہوم رہ جاتا ہے۔ کسی شے کی بیرونی سطح کی پردہ دری کر کے اس کے اندرونی معانی تلاش کرنے کی جرأت اس کی رائے میں غیر مہذّب ذوق کا ایک ناقابلِ عفو اظہار ہو جاتی ہے۔ جسمانی لذّات کی متعدّی مادیّت اُس کی

روح کو ایک غیر حسّاس جسمانیت سے معمور کر دیتی ہے۔ نیکی یا بدی کو وُہ صرف محبّت یا نفرت، مہربانی یا غضب، خوشی یا غم کی طرح انسانی طبیعت کے عارضی جذبات تصور کرنے لگ جاتا ہے جو پہلے کی تیاری یا بعد کی پشیمانی کی ضرورت کے احساس کے بغیر محض عناصر کے اتفاقی میلان سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اب دن رات اپنی رائے کو معطل کئے، نیکی اور بدی کی تمیز کو ایک عامیانہ کوشش سمجھے شیطان کی اُس دلکش جادو کی لکڑی کے اشاروں پر جسے عرفِ عام میں گناہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حرکت کرتا رہتا ہے۔ اور خود اس سحر سے مسحور ہو کر ہر اس چیز کو جو اس سے مس کرتی ہے۔ اسی طرح مسحور کر دیتا ہے۔

خوبصورتی یا بدصورتی، مناسب یا نامناسب، جائز یا ناجائز میں تمیز کرنے کے لئے اب اس کے پاس کوئی معیار نہیں رہتا۔ فطرت اِس بغاوت کا انتقام لینے کے لئے اس کو قوتِ انتخاب سے محروم کر دیتی ہے اور وہ ایک ایسے پتھر کی طرح جو کسی پہاڑ کی انتہائی بلندیوں سے گرنا شروع ہو کر اپنی مرضی کو استعمال کئے بغیر، پستی کی کسی گہرائی

ہیں امتیاز کئے بغیر، وادی کی نامعلوم اور عمیق گہرائیوں کی جانب لڑھکتا چلا جاتا ہے، بداخلاقی کی اسفل سے اسفل پستیوں میں، بدکاری کے ذلیل سے ذلیل قعر میں گرتا چلا جاتا ہے۔

اظہار

اظہار اور حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ بچّے کی ولادت کے وقت ماں کا خوشی سے مسکرانا اور انتہائی مسرّت کے وقت آنکھوں میں آنسوؤں کا بھر آنا اسی اختلاف کی روشن دلیلیں ہیں۔

حماقت

لازم ہے کہ انسان کی عمر اس کی حماقتوں کی عمر سے زیادہ ہو۔ ورنہ اس کی حماقتیں اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں

بدقسمتی

حسن، دولت کے بغیر بدقسمتی ہے۔

فنا اور بقا

ایک دن یہ رُودِ گنگا نے سمندر سے کہا
کس بلا کی ہیں تری ظالم، فنا سامانیاں
میری دلداری کو دیکھ اپنی دل آزاری کو دیکھ
ہائے اب تک بے اثر ہیں میری سب قربانیاں
تیرے شوقِ وصل میں آغوشِ مادر چھوڑ کے
نازنینِ قصرِ ہمالہ کی پریشاں ہو گئی!
دشت میں نکلی تلاشِ یار میں جوگن بنی!
جب سے تجھ کو دل دیا میں خانہ ویراں ہو گئی

گھر گیا، آرام چھوٹا۔ نام تک باقی نہیں
میں نے اپنی ساری ہستی کو دیا تجھ میں مٹا!

اس پہ بھی تیری یہ بے پروائیاں خودداریاں
تو ہی غارت گر بنا یہ وصل ہے یا ہے فنا

شکوہ سن کر ہو گئی پُر آب چشمِ بحرِ ہند
ایک موجِ غم ہوئی پیدا دلِ بیتاب میں
آئی پھر آواز اے نامحرمِ اسرارِ وصل
ڈھونڈھ عیشِ جاوداں اس وصلِ حسرت یاب میں

تشنہ کامِ لذتِ دیدارِ حسن میں نے تجھے
لے کے آغوشِ محبّت میں سمندر کر دیا
تیری چشمِ آبگیں سے جب کوئی آنسو گرا
اس کو اپنے دل میں رکھا اور گوہر کر دیا

گھر اگر چھوڑا تلاشِ منزلِ مقصود میں
دیکھ اِک عالم کے چشم و دل میں تیرا گھر بنا

یہ ہے فیضِ جذبۂ اُلفت کہ تیرا نقشِ پا!
جادہ پیمایانِ راہِ عشق کا مسند بنا

لطف کب حاصل ہیں وہ عاشق کو وصلِ یار میں
جو مزے ہیں کوششِ تکمیلِ مقصد میں نہاں

چھوڑ کر رسمِ طلب اِس لطف کو فانی نہ کر
دیکھ ٹھنڈی ہو نہ جائیں شوق کی سرگرمیاں

چھوڑ دے قطرے کی فطرت بحر میں مل بحر بن
ہستیٔ موہوم کا جینا بھی کچھ جینا ہے کیا

تیری اُلفت کی قسم تو مِٹ نہیں سکتی کبھی
ہے بقا کی ابتدا جس کو تو سمجھی ہے فنا

پچھلے پچاس برس

شور یست نوا ریزیٔ تارِ نفسم را
پیدا نہ اے جنبش مضراب کجائی
(غالبؒ)

نشو و نما

میں یکم صفر المظفر ۱۳۱۴ھ ہجری المقدس کو پیدا ہوا۔ میرے والدِ ماجد حکیم شجاع الدین محمد اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب تھے۔ سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں مہارتِ کامل رکھتے تھے۔ خزینۂ حزینہ اہلِ بیت علیہم السلام کے مرثیوں کا مجموعہ اور داغِ ہجران اُن کے اشعار کا دیوان اُن کی شاعری کی یادگار ہیں۔ اُس وقت پنجاب میں اُردو شاعری ابھی طفولیّت کے عالم میں تھی۔ مرزا ارشد گورگانی، میر فیض الحسن اور سیّد ناظر حسین ناظم کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا کچھ کچھ چرچا ہو چلا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی انہیں ایام میں اُردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوشش میں مصروف

تھے۔ ڈاکٹر لائیٹنر جو اُس زمانے میں محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے اُن انگریزوں میں سے تھے جو ہندوستانی علوم و فنون کی سرپرستی کا درجہ، نظم و نسق حکومت کے درجے سے کچھ کم نہیں سمجھتے۔ اُن کی توجہ کی آبیاری سے پنجاب میں اُردو کا باغ پھول پھل لا رہا تھا۔

مَیں نے بزرگوں کی زبانی سُنا ہے کہ ۱۸۹۰ء میں میرے والد نے اُردو زبان کی روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر فارسی اور عربی میں شعر کہنا چھوڑ دیا اور ایک اُردو بزمِ مشاعرہ کی بنا ڈالی۔ "شورِ محشر" اسی بزمِ مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے عمزاد بھائی حکیم امین الدین بیرسٹرایٹ لاء کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا ماہانہ "شورِ محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اِس رسالے کے ایڈیٹر شعر و شاعری میں میرے سب سے پہلے استاد خان احمد حسین خان تھے۔ جن کی شہرت ایک ناولسٹ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔

سر محمد اقبالؒ نے جو اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی۔ اتفاق کی بات ہے۔ جس سال مَیں پیدا ہُوا۔ اُسی سال اقبال نے اِسی مشاعرے میں وہ شعر پڑھا جس کا چرچا بہت دیر تک اربابِ ذوق کے حلقوں میں رہا اُن کا یہ شعر اب تک بہت سے لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے گرے تھے جو عرقِ انفعال کے

اِس واقعے کے بیس برس بعد سر محمد اقبال نے ایک دن مجھ سے کہا "تم اور میری شاعری ہم عمر ہو۔ تم دونو کی جوانی سدا بہار ہے"!

جب تک میرے والد زندہ رہے۔ یہ بزمِ مشاعرہ قائم رہی۔ مرزا ارشد گورگانی دِلّی اسکول کے پیرو تھے۔ اور میر ناظر حسین ناظم لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ۔ دونو کی ٹولیاں جب اِس بزمِ مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لئے مصروفِ غزل خوانی ہوتی تھیں۔ تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اُس زمانے میں بھی میر اور میرزا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے اور اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعراء میر اور میرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار رہتے تھے۔ بہر حال اُس بزم کی رونق اِسی ہنگامے پر موقوف تھی۔ اور جب تک یہ ہنگامہ رہا "شورِ محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔

۱۸۹۶ء کے آخر میں میرے والدِ ماجد نے اِس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ اُس وقت میری عمر کوئی ڈھائی برس کی تھی۔ میرے

عمزاد بھائی حکیم امین الدین نے میرے دوسرے عمزاد بھائی حکیم شہباز دین کے ساتھ مل کر "شورِ محشر" کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی، نہ بنی۔ اور جذبِ صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی۔ نوجوانوں کی ہمّت کو نصیب نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات ضرور ہوئی۔ وہ صاحبانِ ذوق جنہیں اس بزمِ مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی۔ اب ہر روز ہمارے مکان پہ جمع ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا اچھا خاصا کلب بن گیا۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ ہمارے مکان کی بیٹھک میں برسوں تک ہر شام وہ لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ جن میں سے ایک ایک آسمانِ ادب کا درخشاں ستارہ تھا۔ حکیم شہباز دین ایک بہت ہی لاغر اور نحیف انسان تھے۔ مگر اُن کے سینے میں ایک ایسا دل تھا۔ جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی۔ وہ جو کچھ کماتے اپنے احباب کی خاطر مدارات پہ صرف کر دیتے۔ اُن کی زبان کی شیرینی، اُنکی منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ہمارے گھر کو علم و ادب کے اِن درخشاں ستاروں کا مرجع بنا دیا۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ اِن اربابِ علم و ادب کی دید کے شائق دُور دُور سے ہمارے ہی مکان پہ آتے۔ اور

اِن کی صحبت سے اکتسابِ شرف کرتے۔ سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن، مفتی عبداللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل اُن لوگوں میں سے تھے۔ جو قریب قریب ہر روز شام کو اِس بیٹھک میں جمع ہو جاتے۔ اِن لوگوں میں کچھ بزرگ تو ایسے ہیں جو بعد میں اس قدر مشہور ہوئے۔ کہ اُن کے کمالات کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مگر ناظرین کی واقفیت کی توسیع کے لئے شاید یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ مولوی احمد دین "سرگزشتِ الفاظ" کے نامور مصنّف ہیں۔ اور شیخ گلاب دین قانونِ شریعت و رواج کے مشہور مولف۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، سیّد محمد شاہ وکیل اور خلیفہ نظام الدین اگرچہ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظرِ عام پر نہ آئے مگر وہ اِس مجلس کی روح و رواں تھے۔ اُن کی جرأتِ تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں وہ حصّہ لیا۔ جو اُن کے اپنے جوہرِ کمال کے تقاضاتِ ارتقاء سے کسی طرح کم نہیں۔ اس زمانے میں سر محمد اقبال جب تک اپنا کلام پہلے اِن بزرگوں کو سُنا نہ لیتے تھے، اُسے کسی مجلسِ عام میں نہ پڑھتے تھے۔ نالۂ یتیم، ہلالِ عید اور تصویرِ درد

کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انہیں لوگوں کے سامنے پڑھیں اور پھر اُنہیں انجمنِ حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر جہانِ اسلام سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کیا۔

سر محمد شفیع جو اُس زمانے کے ایک مشہور قانون دان تھے اور بعد میں ہندوستان کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہوئے۔ اور میاں محمد شاہ دین بھی جو ہمایوں تخلص کرتے تھے اور بعد میں پنجاب کے چیف کورٹ کے پہلے مسلمان جج مقرر ہوئے۔ کبھی کبھی اس بزمِ علم و ادب میں شریک ہو کر اُس کی رونق بڑھاتے اور ان ناموروں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے۔

مولوی محمد حسن جن کا وطنِ مالوف جالندھر ہے، ہمارے سارے خاندان کے استاد اور پنجاب کے قریب قریب ہر شریف گھرانے کی نظر میں قابلِ احترام اور محبوب بزرگ تھے۔ ان کی باتیں درسِ اخلاق تھیں اور اُن کی سیرت محاسنِ اسلامی کا آئینہ۔ اِس مجلس میں جو اسلامی رنگ نظر آتا تھا۔ وہ انہیں کے اوصاف و اطوار کا پرتو تھا۔ شریعت کی عظمت اور سیرتِ نبویؐ کی تقلید کی اہمیت کے جو غیر فانی نقوش میرے دل پر آج تک نقش ہیں۔ وہ اِسی بزرگ کی صحبت کا اثر ہیں۔

مفتی عبداللہ ٹونکی اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔

اور فقہ اسلامی کے بہت بڑے عالم اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں اُن کا فتویٰ ناقابلِ تردید سند تھا وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ اُن کی زبان سے نکلتا تھا۔ برہانِ قاطع کا حکم رکھتا تھا۔ اِسلامی فقہ کی باریکیوں سے میری شناسائی اور قرآنی احکام کی حکمتوں سے میری واقفیت انہیں رموز و نکات کے علم کے باعث ہے جو میں نے اُن کی زبان سے سُنیں۔ اور جو میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہیں۔

میرے عمزاد بھائی حکیم امین الدین جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ جب کبھی پشاور سے آتے۔ تو یہ محفلِ اربابِ ذوق حکیم شہباز دین کی بیٹھک سے منتقل ہو کر اُن کے مکان پر منعقد ہونے لگتی۔ وہ علم و فضل میں خود یکتائے روزگار تھے۔ اُن کی ذکاوت اور طلاقت اُس زمانے میں مشہور تھی۔ اُن کی فیاضی اور مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ میں نے اُن کے دروازے سے کسی سائل کو عام اِس سے کہ اُس کی کیا حیثیت ہوتی، کبھی خالی ہاتھ جاتے نہ دیکھا۔ اُن کے دسترخوان پر جب تک خواندہ اور ناخواندہ مہمانوں کا جمگھٹا نہ لگ جاتا۔ وہ کبھی کھانا نہ کھاتے۔ اُن کے تبحّرِ علمی کی یہ کیفیت تھی کہ میرے کتب خانے میں اب بھی انگریزی، فارسی اور اُردو کی پانسو سے زیادہ ایسی

کتابیں موجود ہیں۔ جن پر اُن کے قلم کے لکھے ہوئے حواشی اُن کی معلومات کی وسعت اور ان کی تنقید کی گیرائی کی دلیلِ روشن ہیں۔ اُن کی موجودگی سے اِس محفلِ ادب کی گوناگوں دلچسپیوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ یہ اپنے اپنے کاروبار میں ہشیار، متین اور سنجیدہ بزرگ آپس میں مل کر کس طرح معصوم بچوں کی طرح خوش ہوتے تھے۔ اور پُر شباب نوجوانوں کی طرح نشاط و انبساط کے زندہ پیکر بن جاتے تھے۔

اِن باتوں کی تفصیل اِس کتاب کے تعارف کے سلسلے میں محض ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ مقصدِ بیان یہ ہے۔ کہ مَیں نے مبداء فیاض کے کرم سے ایک ایسے گھرانے اور ایسے ماحول میں پرورش پائی۔ جو علم و ادب کا گہوارہ اور فضل و کمال کا منشا تھا۔ جس سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ اُس پر اب ایسے بزرگوں کا دستِ عاطفت تھا۔ جو میرے والدِ مرحوم کی محبّت اور شفقت کا صِلہ صرف اسی طرح دینا چاہتے تھے کہ مجھ سے محبّت اور شفقت کریں۔ مَیں نے جو کچھ مدرسے میں پڑھا۔ اُس سے بہت زیادہ اِن بزرگوں کی صحبت سے سیکھا۔ علم و دانش کے جو موتی مَیں نے کتابوں سے جمع کئے، اُن سے بہت زیادہ

درخشاں اور آبدار جواہر مَیں نے اِن لوگوں کی زبان سے لُوٹے۔

۱۹۰۷ء میں میری والدۂ ماجدہ بھی مجھے داغِ مفارقت دے گئیں۔ جس کی بدولت یہ دنیا خوبصورت نظر آتی تھی، وہ دولت ہاتھ سے جاتی رہی۔ باپ کی وفات کے بعد جس ماں نے باپ کا غم دل سے محو کر دیا تھا۔ اُس کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کے بارِ احسان سے ہر بچّے کی گردن خم ہے۔ مگر جو احسان میری ماں نے مجھ پر کیا وُہ ہر عہدہ برائی سے بالاتر ہے اور ہر صلے سے بے نیاز۔

یہ جگہ ذاتی تذکروں کی تفصیل کے لئے مناسب نہیں۔ تاہم اگر کوئی ایسی بات بیان ہو جائے۔ جس کا اثر میرے علمی مشاغل اور میری ادبی مصروفیتوں پر پڑا۔ تو کچھ ایسا حرج بھی نہیں۔ میری ماں زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں۔ مگر اُن کا نسبی تعلق کابل کے شاہی خاندان سے تھا۔ اور انہوں نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ جس کے افراد صاحبِ شمشیر اور صاحبِ تدبیر تھے۔ اِس لئے اُن کی زندگی ضبط کی عادی، حکومت کی خُوگر اور تدبّر و تفکر کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے مجھے ایک ہی سیدھے سادے سے فقرے میں زندگی کا وہ راز بتا دیا۔ جو ہزار بہی خواہوں کی کوشش اور ہزار معلّموں کی کاوش نہ سِکھا سکتی تھی۔ جب مَیں نے ذرا ہوش سنبھالا۔ اور پڑھنا لکھنا

شروع کیا۔ تو انہوں نے مجھ سے ایک دن بڑے پیار سے صرف اتنی سی بات کہی "دیکھو اس طرح پڑھا کرو۔ گھر میں اور باہر ایسے رہا کرو۔ کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔ کہ تمہارا باپ تمہارے سر پر موجود نہیں"۔ کہنے کو تو یہ ایک ذرا سی بات تھی۔ مگر ماہرانِ نفسیات ہی جان سکتے ہیں۔ کہ یہ کتنی بڑی بات تھی۔ کم از کم میں جانتا ہوں۔ کہ اِن دو چار لفظوں کا اثر میری زندگی پر کیا ہوا۔ میری ماں نے مجھے وقت کی پابندی سکھائی۔ جسمانی اور دماغی تربیّت کی اہمیّت بتائی۔ بُردباری، رواداری اور شرافت کے سبق پڑھائے۔ مکارمِ اخلاق کے آداب بتائے۔ مگر سب سے بڑی چیز جو انہوں نے مجھے سکھائی اور جو عمر بھر میرے کام آئی۔ وہ خدا کا خوف اور مذہب کا احترام تھا۔ اللہ اُن کو اِس احسان کا صِلہ عطا فرمائے۔

ہم اپنے ماں باپ کے نو بچّے ہیں۔ ایک بھائی اور آٹھ بہنیں۔ مجھ سے صرف ایک بہن چھوٹی ہے۔ باقی سب بڑی۔ میری سب سے بڑی بہن کی شادی میرے تایا کے بیٹے حکیم امین الدین سے میرے والد کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ اُن سے دو چھوٹی بہنوں کی کی شادی بھی میرے والد کی زندگی میں دیپال پور کے دودمانِ سادات کے عالی مقام سجادہ نشین حضرت سخی سیدن سائیںؒ کے دو پوتوں

سیّد مبارک اور سیّد محمدؒ سے ہو گئی تھی۔ والد مرحوم کی وفات کے بعد میری والدہ کو دن رات یہی فکر رہتی تھی۔ کہ میری ناکتخدا بہنوں کی شادی کا فرض اگر اُن کے باپ کی زندگی میں ادا نہیں ہو سکا۔ تو اُن کی ماں کی زندگی میں ضرور ادا ہو جائے۔ اور اِن کی شادی بھی ایسی جگہ ہو۔ کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے۔ کہ ماں نے بیٹیوں کی زندگی خراب کر دی۔ لڑکیوں کا باپ زندہ ہوتا تو اِن کی شادی بھی اچھے گھرانوں میں ہو جاتی۔

سنہ ۱۸۹۸ء میں میری ایک بہن کی شادی مصطفےٰ آباد کے مشہور بخاری سادات کے صاحبِ سجادہ حضرت سیّد حیدر امامؒ کے پوتے سیّد ملک شاہ سے اور دوسری بہن کی شادی پیر کوٹ سیدانہ کے نامور بزرگ حضرت سیّد عبدالقادر ثانیؒ کے پوتے سیّد محمدؒ شاہ گیلانی سے ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں میری تیسری بہن کی شادی بھی حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین دیوان سیّد محمدؒ سے ہو گئی۔ خدا نے میری ماں کی آرزوں کی لاج رکھ لی۔ اور اس بیکس کی دعائیں قبول کیں۔ جن گھرانوں میں میری یہ تین بہنیں گئیں۔ وہ اپنی شرافت، نجابت اور اقتدار و احترام کے اعتبار سے کسی طرح بھی اُن گھرانوں سے کم نہ تھے۔ جہاں میری تین بڑی بہنیں بیاہی گئیں تھیں۔ مگر خدا کو یہ بات منظور نہ تھی۔ کہ باقی اولاد کی شادی کا

سہرا بھی ماں دیکھ سکے۔ ہم تینوں بچے ابھی کم عمر تھے۔

۱۹۰۷ء میں جب میری ماں کا انتقال ہوا۔ تو مجھے اپنی کمسنی کے باوجود بہنوں کی شادی کے متعلق تردد رہنے لگا۔ یہ تردد حقیقت میں کچھ بے معنی سا تھا۔ چھوٹی بہنوں کی شادی کی فکر کے لئے بڑی بہنوں نے اپنی ساری توجہ وقف کر رکھی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اِن دو بہنوں کی شادی بھی ہو گئی۔ ایک کی نواب امام الدین خاں والئے کشمیر اور فاتحِ ملتان کے بڑے نواسے سید اقبال علی شاہ سے اور دوسری کی اُنہیں کے چھوٹے نواسے خان بہادر سید مراتب علی شاہ سے۔

والدہ کی وفات کے بعد میری تعلیم و تربیت کا بارِ گراں میرے عمزاد بھائی اور بڑے بہنوئی حکیم امین الدین اور میری بڑی بہن نے اِس محبت اور شفقت سے سنبھالا۔ کہ جب تک میں اُن کے پاس رہا۔ مجھے لوگوں نے انہیں کا نورِ نظر اور لختِ جگر سمجھا۔ یوں تو وہ میری تعلیم و تربیت کی نگرانی میرے والد کی وفات کے بعد ہی سے کر رہے تھے لیکن جس انہماک سے وہ اب میری طبیعت کی تعمیر میں مصروف ہوئے اس کی مثال میں نے اپنے تجربے میں کسی باپ اور بھائی میں نہیں دیکھی۔ اُن کا وقت اب میرے لئے وقف تھا۔ اور اُن کی دولت

صرف اسی لئے تھی۔ کہ میری تعلیم پر صرف کی جائے۔ انھوں نے مولانا شربت علی کو جو اپنے وقت کے مجتہد اور مشہور مفسر تھے، مجھے عربی اور فارسی پڑھانے کے لئے مقرر کیا۔ اور پروفیسر لینگ ہارن کو جن کا علم آج انگلستان میں بھی سند متصوّر ہوتا ہے۔ مجھے شکسپیر پڑھانے پر بصد مشکل رضامند کیا۔ اور سب سے بڑھ کر جو احسان انھوں نے مجھ پر کیا وہ یہ تھا کہ ان تمام مشکل اور بسیط کتابوں کا ماحصل، جن کا پڑھنا اس زمانے میں میرے لئے دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ انھوں نے مجھے اس طرح بتا دیا جس طرح کسی کثیر المقدار دوا کا ذراسا ست نکال کر پلا دیتے ہیں۔ ان کی اس کوشش اور کاوش کی بدولت میں اردو، فارسی اور انگریزی کے ادب سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ تاریخ فلسفہ، دینیات اور ان کے متعلقات سے میری شناسائی اس وقت بھی غیر معمولی تھی۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی کوئی ایسی قابل اعتنا اور معروف کتاب نہ تھی۔ جو میری نظر سے نہ گذر چکی ہو۔ فارسی اور اردو کے مشہور شعراء کے ہزاروں اشعار مجھے ازبر تھے۔ اور ادب کی کوئی ایسی صنف نہ تھی۔ جس میں مجھے اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل نہ تھی۔

تعلّی مقصد بیان نہیں۔ مگر اللہ کے فضل و کرم کا ذکر اور نہ کروں

کے احسان کا بیان ایک فرض ہے، جو ادا ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ پروفیسر لیننگ ہارن کے علم و فضل اور ان کی محبّت و شفقت کا یہ نادر کرشمہ ہے۔ کہ میں نے پندرہ ہی برس کی عمر میں شیکسپیئر کے تخیّل، اس کے اسلوبِ نگارش اور اس کی نظم کی باریکیاں سمجھنے اور بیان کرنے میں اتنی مہارت پیدا کر لی۔ جو اُس وقت بھی حیرت انگیز تھی اور آج بھی حیرت انگیز ہے۔ اُردو ادب سے میری شناسائی کی یہی سند کافی ہے کہ سر عبدالقادر نے اپنے مقبولِ عام و خاص ادبی رسالے مخزن میں اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنے مشہور و معروف تنقیدی جریدے پنجاب ریویو میں میری نظمیں اور مضمون شائع کئے۔ سر عبدالقادر اور مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے کسی مضمون کا انتخاب اور مخزن اور پنجاب ریویو میں کسی مضمون نگار کی تصنیف کی اشاعت اُس زمانے میں فضل و کمال کی ایسی معراج تھی جو کسی کو نصیب ہوتی تھی۔

ماں کی تربیت، بھائی کی صحبت اور استاد کے صحیح طریقۂ تعلیم کا اُدھر یہ نتیجہ ہؤا۔ کہ عبادت کا شوق اور اللہ کے کلامِ پاک میں تدبّر کا ذوق اِس درجہ بڑھ گیا۔ کہ مجھے جو لطف اِن مشاغل میں آتا تھا۔ وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہ ہوتا تھا۔

میں اپنے والد کے پیر و مرشد حضرت خواجہ اللہ بخش رح تونسوی

کی دُعا سے پیدا ہُوا۔ اور میں نے بچپن ہی میں اُن کے دستِ بابرکت پر بیعت کی۔ میرا ایمان ہے۔ کہ جو سعادتیں اور کامیابیاں قرآن مجید کے فہم و ادراک کے سلسلے میں مجھے نصیب ہوئیں۔ وہ انہیں کی دعا کا اثر اور انہیں کے تصرّف کا ثمر ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ میری ایک بہن کی شادی حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمۃ کی درگاہِ اقدس کے سجادہ نشین حضرت دیوان سیّد محمدؐ سے ۱۹۰۰ء میں ہو گئی تھی۔ میں اپنی ہمشیرہ سے ملنے کے لئے کم عمری کے باوجود اکثر پاکپتن شریف حاضر ہُوا کرتا تھا۔ یہ قرابت میرے لئے روحانی سعادتوں کا ایک وسیلہ بن گئی۔ اُس وقت سے لے کر اِس وقت تک حضرت گنج شکر علیہ الرحمۃ کی درگاہِ فلک بارگاہ میں ایسے ایسے اولیاء کرام اور پیرانِ عُظّام کی صحبت کی سعادت میسّر آئی ہے۔ اور ایسے ایسے صاحبِ نظر و کشف بزرگوں سے فیض پایا ہے جن کے روحانی کمالات اور باطنی تصرّفات کے بیان کے لئے ایک مستقل تذکرے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں اِس بات کو اِس تعارف کے لئے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔ کہ آسمانِ ایمان و عرفان کے ان درخشاں کواکب کے اسمائے گرامی سے اِن اوراق کو بھی مزّین کر دوں۔ جن کی یاد میرے ذہن کا سب سے قیمتی سرمایہ اور جن کی دعائیں میری

زندگی کی سب سے بڑی زینت ہیں۔

حضرت میاں محمد خاںؒ جن کے دم قدم سے لسبی ضلع ہوشیار پور کا ایک چھوٹا سا موضع ارادتمندوں کا قبلہ اور عقیدت کیشوں کا کعبہ بن گیا۔ حضرت پیر مہر علی شاہؒ جن کے قدوم میمنت لزوم کی سعادت سے گولڑہ ضلع راولپنڈی کا ایک چھوٹا سا قصبہ مہبط انوارِ عرفان اور موردِ تجلیاتِ ایقان ہے۔ میرے پیر و مرشد حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کے صاحبزادے حضرت محمد موسےٰؒ اور حضرت محمد محمودؒ جن کی آنکھوں میں اپنے نامور دادا حضرت خواجہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا جلال اور جن کی صورت میں اپنے والدِ محترم کا جمال تھا۔ اور وہ صاحب کشف و کرامت مجذوب جو آج سے تیس چالیس برس پہلے "لوہے والے سائیں" کے لقب سے طول و عرض ہند میں مشہور تھے۔ ان سب کا فیضانِ نظر مجھے حضرتِ گنج شکر علیہ الرحمۃ کے آستانۂ مبارک ہی پر میسر آیا۔ اللہ اللہ ان بزرگوں میں سے ایک ایک کے احسان و کرم کی روئداد کیسے بیان ہو۔ اور وہ راز جو احاطۂ تحریر میں نہیں سما سکتے اور جن کے اظہار پہ تقریر قادر نہیں، بیان بھی ہوں تو کیونکر ہوں۔ اتنا ہی کہہ دینا بس ہے کہ اِن سب بزرگوں نے اپنے اپنے سلسلے کے وظائف و اوراد مجھے بخش دیئے۔ اور مجھ کو اپنی اپنی راہ سے اُس

منزل پر پہنچا دیا۔ جو سب عُشّاق کا مقصود ہے اور ہر عارف کے دل میں موجود۔

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو و سمن
ہمہ ز شاخ بریدند و در تو پیوستند

میں اسی زمانے میں حضرت کے آستانہ مبارک کی ایک حاضری کے دَوران میں حضرتِ محبُوبِ الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے خواہرزادے خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں باریاب ہُوا۔ اگرچہ اُس وقت اُن پر شباب کا عالم تھا۔ مگر اُن کی آنکھوں میں تجلیاتِ عرفان روشن اور اُن کی گفتگو سے رشد و ہدایت کے چشمے جاری تھے۔ بعد میں انہیں کی مہماں نوازی کی بدولت مجھے دِلّی میں حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانۂ مبارک کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا۔ اور مہرولی شریف میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ پُرانوار پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے پیر و مرشد کے تصرّف کی بدولت سلسلۂ عالیہ نظامیہ کے مقاماتِ مقدسہ سے اکتسابِ خیر و برکت کا انتظام میرے لئے پہلے ہی سے ہو چکا تھا۔ مہرولی شریف میں قلب پر کچھ ایسی کیفیّت طاری ہوئی۔ کہ اجمیر شریف حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا۔

حضرتِ خواجۂ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ مبارک کی کشش کچھ ایسی نہ تھی۔ کہ میرے ارادے اور اُس کی تکمیل میں کوئی چیز سدِّ راہ ہوتی۔ اجمیر شریف حاضر ہو کر جب میں اُس شہنشاہ کے دربار میں باریاب ہُوا۔ جس کے عتبۂ عالی پر بڑے بڑے بادشاہوں کے سر جھک چکے تھے۔ اور جس کے مزارِ مقدّس کی خاکِ پاک بڑے بڑے اولیاؔ اور اصفیا کی آنکھوں کا سُرمہ بن چکی تھی، تو سماع کی وجد آفرینیوں سے قلب پر نشاط و انبساط کا کچھ ایسا کیف طاری ہُوا اور آنکھوں نے اُس ہیکلِ نور سے اُن انوار کو برستے دیکھا کہ اُن کی یاد آج تک جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش ہے۔

۱۹۰۵ء میں میرے بھائی حکیم امین الدین مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی لے گئے تھے۔ وہ اُس وقت بھی چاہتے تھے۔ کہ میں انہیں کے زیرِ سایہ رہوں۔ اور انہیں کے ایما و ہدایت کے مطابق تعلیم حاصل کروں۔ مگر میری والدہ کی محبّت میری مفارقت کو بہت دن تک برداشت نہ کر سکی۔ اور مجھے جلد ہی لاہور واپس آنا پڑا۔ حُسنِ اتفاق سے راولپنڈی میں میری ملاقات مسلمانوں کے ہر دلعزیز رہنما سر سیّد احمد خاںؒ کے دستِ راست اور واہ کے مشہور سردار نواب محمد حیات خاں کے نوعمر اور بلند اقبال صاحبزادے سکندر حیات خاں

سے ہو گئی - اس وقت کون جانتا تھا - کہ قریب قریب چالیس برس کے بعد ہم دونو کی دوستی اُن نازک مگر مستحکم بنیادوں پہ استوار ہو جائے گی جو دو شریف گھرانوں اور ایک دوسرے کے جوہر نجابت کی قدر کرنے والے دو دوستوں کے غیر فانی تعلقات کی بنا ہؤا کرتی ہے ۲۴ دسمبر ۱۹۴۲ء کو میری بیٹی خورشید جہاں آرا کی شادی پنجاب کے پہلے وزیرِ اعظم سر سکندر حیات خاں کے بیٹے سردار عظمت حیات خاں سے ہو گئی -

میں نے چھٹی جماعت سے لیکر میٹریکولیشن تک سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں تعلیم پائی - یہ مدرسہ اُس وقت بھی آج کل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا - اور پنجاب کے سر رشتۂ تعلیم نے اِس بات کا خاص انتظام کر رکھا تھا کہ اِس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید النظیر اور طریقۂ تعلّم میں عدیم المثال ہوں - مولوی سیّد احمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت پربھو دت شاستری، لالہ شب دیال، مرزا محمد سعید اور مولوی عبداللہ خاں جہاں تعلیم و تعلّم میں سخت کوش تھے - وہیں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلبہ میں ہر دلعزیز اور حکّام کی نظر میں واجب احترام تھے - یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دَوران میں ایسے ایسے نامور ہیڈ ماسٹروں

کی نگرانی میں سرچشمۂ علوم وفنون رہا۔ جن کے نام جوہرِ کمال کے ضامن اور ثقافت وشرافت کے کفیل ہیں۔ رائے بہادر شودیال۔ رائے بہادر سندر داس سوری، مسٹر ٹائیڈمین، مسٹر لینگ ہارن، مسٹر وائٹ اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر نولٹن وہ شفیق اُستاد تھے۔ جنہوں نے مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔ میرے ذہنی نشو ونما کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک میں اِن بزرگوں میں سے ایک ایک کا احسان نہ مانوں۔ جنہوں نے اپنے لطفِ نظر سے مجھ میں جوہرِ قابل دیکھا اور اُس کی تربیت میں وہ کوشش کی جو صرف ماں باپ ہی اولاد کی تربیت میں کر سکتے ہیں۔ مولوی سیّد احمد کبیر مجھے برسوں تک اپنے گھر پڑھاتے رہے۔ اور مولوی غلام رسول اور لالہ مدن گوپال نے بسا اوقات مجھے اپنے اپنے گھر رکھ کر امتحانوں کی تیاری کرائی۔ اور خاندانی تعلقات کی بنا پر اِس تمام عرصے میں میری نگرانی اِس طرح فرمائی کہ میں اُن کو اپنا بزرگ سمجھتا رہا۔ اور اُن کی اولاد سے آج اپنی اولاد کی طرح محبّت کرتا ہوں۔

انہیں ایّام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسّر آئی۔ جس

کا ذکر میرے تخیّل کی مسرّتوں کی معراج اور عمرِ گزشتہ کی ساری کامیابیوں کا سرور و کیف ہے۔ ادیب سحر نگار ابوالکلام آزاد جو اُس زمانے میں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ اپنے پُرانے دوست اور ہمارے استاد مولوی غلام رسول سے ملنے لاہور تشریف لے آئے۔ مولوی غلام رسول ابوالکلام آزاد کی نوعمری کے باوصف، اُن کے علم و فضل کے قائل اور اُن کے جمال و کمال کے دلدادہ تھے۔ جب ابوالکلام اُن سے ملنے آئے تو اُس وقت وہ ہماری جماعت کو عربی پڑھا رہے تھے۔ مصافحے اور معانقے کے بعد مولوی غلام رسول نے ابوالکلام آزاد سے کہا "آپ میرے شاگردوں کو بھی ایک دو لفظ پڑھا دیں تاکہ وہ آپ کی شاگردی کی سعادت سے بہرہ مند ہو جائیں" یہ سنتے ہی علم و فضل کا ایک بحرِ موّاج تھا کہ اُبل پڑا۔ حکمت و دانش کا ایک ابرِ محیط تھا۔ کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اِس بحرِ بیکراں کی اُچھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا۔ اور اِس ذرا سے وقت میں اُس بارشِ کرم کے جتنے موتی جمع ہو سکتے تھے اُن سے اپنا دامن بھر لیا۔ مَیں اُس دِن سے

آج کے دن تک جناب ابوالکلام آزاد کو اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے بعد اُن کے مشہورِ زمانہ جریدہ "الہلال" میں جو کچھ پڑھا اور اس کے مضامین سے جو کچھ سیکھا۔ وہ حقیقت میں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک جرّعہ، اور اسی دانائے رموزِ ادب کے خوانِ نعمت کی خیرِ جاری کا ایک ریزہ تھا۔

۱۹۰۹ء میں میری تعلیمی زندگی کا پہلا دَور ختم ہوتا ہے کیونکہ اسی سال مَیں نے میٹریکولیشن کا امتحان دیا۔ اُوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اُس میں میری تعلیمی اور روحانی زندگی کے اُس پہلو کا ذکر ہے جس کی نشوونما استادوں کی شفقت اور بزرگوں کی توجّہ کی مرہونِ منّت ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ تفسیرِ قرآن کی تالیف کا وہ عظیم الشان کام جو آگے چل کر مجھ سے ہونے والا تھا، اُس کی داغ بیل میری سرشت کی گہرائیوں میں اُن لوگوں کی صحبت کے نقوش اور گفتگو کے اثرات سے پڑ چکی تھی۔ جن کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت مجھے بچپن ہی میں میسّر آئی۔ لیکن اس دَور کے اثرات کی تفصیل بالکل تشنہ رہ جائے گی۔ اگر میَں بہت ہی اجمال کے ساتھ اپنی زندگی کے اُس پہلو کی تربیت کا ذکر نہ کروں جس کا تعلق میری جسمانی اور مجلسی صلاحیّت سے ہے

میر فیض الحسن دہلوی جو علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائے اور چیف کورٹ لاہور میں ملازم تھے۔ ہمارے دیوار بہ دیوار رہتے تھے۔ خدا جانے انہوں نے ہمسائیگی کا فرض ادا کیا، یا اُن کو ایک ایسے ہونہار بچّے کی مجلسی تربیت کا خیال آگیا۔ جس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ یا اُن کی طبیعت میرے اُس ادب اور احترام سے کچھ خوش ہوگئی۔ جس سے میں ہر روز جب وہ دفتر جاتے تھے۔ انہیں سلام کیا کرتا تھا۔ غرض علّت کچھ ہی ہو۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ انہوں نے میرے دل میں بچپن ہی سے اُردو زبان کی محبّت پیدا کر دی۔ مجھے آدابِ مجلس سکھائے۔ اور دِلّی کے شریف گھرانوں کی عادات و خصائل سے آشنا کیا۔ بائیسکل پر چڑھنا، بیڈمنٹن، ٹینس اور انڈور گیمز کا کھیلنا بھی مَیں نے انہیں سے سیکھا۔ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ اگر مجھے اِس شریف اور نجیب انسان کی صحبت کا فیض میسّر نہ آتا۔ تو علی گڑھ میں میری زندگی ایسی خوشگوار اور میری عادتیں ایسی ہر دلعزیز نہ ہوتیں۔

میرے والد کی وفات کے بعد میرے ماموں شہزادہ رحمدل اپنے مکان سے اُٹھ کر ہمارے مکان ہی میں آ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی موجودگی سے جس قدر بھی ہو سکے اپنی بہن

کا تردّد دُور کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے طبقے کے امراء کی طرح کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ مگر پنجہ کشی اور کشتی کے فن میں استاد تھے بنسری ایسی بجاتے تھے۔ کہ گوکل کے کنہیّا کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ مُرغ، بٹیر اور پتنگ لڑانے میں مہارتِ کامل رکھتے تھے۔ اور ٹھکانے بے ٹھکانے دولت لٹانا خوب جانتے تھے۔ میں نے یہ سارے فن اُن سے سیکھے۔ مگر افسوس کسی فن میں بھی اپنے استاد کی مہارت کو نہ پہنچ سکا۔ وہ میرے بچپن میں سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے، میرے پاس رہے جب میں بڑا ہوا۔ اور اللہ نے مجھے اولاد دی۔ تو انہوں نے میرے بچّوں کو بھی اسی طرح پالا۔ جس طرح انہوں نے مجھے پالا تھا۔ یہ اُن کی مراد مندی کی انتہا تھی، اور شادکامی کی معراج۔

نواب شاہ پسند خان جو شاہجہان کے مشہور وزیر اور میرِ عمارت نواب علی مردان خان کے پوتے اور حکیم امین الدین کے ماموں تھے۔ تلوار اور تیر چلانے، تیرنے اور کھانا پکانے کے فن میں بڑے ماہر تھے۔ میں نے یہ تینوں فن اُن سے بقدرِ صلاحیت سیکھے نوعمری کے زمانے میں، میں اُن کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے سرکنڈوں پر تلوار چلاتا تھا۔ اور اُن سرکنڈوں ہی کا سر

کاٹ کر اپنا جی خوش کر لیتا تھا۔ دو چار قسم کے کھانے میں اب بھی ایسے پکا لیتا ہوں۔ کہ نوابوں کے دستر خوان پر بھی مشکل ہی سے نظر آتے ہوں گے دریاؤں کو تیر کر عبور کرنا تو اب خواب ہو گیا۔ اب یہی آرزو ہے کہ کشتیٔ عمر رواں خیر و عافیت سے ساحلِ مراد پر لگ جائے۔

میرے بہنوئی دیوان سیّد محمّد کے میر شکار میر باز خان گھوڑے اور اُونٹ کی سواری میں مشّاق اور صید افگنی کے ہر فن میں طاق تھے گھوڑے اور اونٹ کی سواری اور نیزہ بازی میں نے اُن سے سیکھی۔ میری طبیعت کی ازلی افتاد کچھ سیر و شکار کے خلاف واقع ہوئی تھی۔ اِس لئے میں نہ تو سیر و سیاحت کی کوئی دشوار گزار منزل ہی طے کر سکا، نہ صید افگنی کے کارناموں کے دفتر میں کوئی نام ہی پیدا کر سکا۔

میں چاہتا ہوں۔ کہ اِس دَور کے تذکرے کا خاتمہ اُن دو محبوب اور محترم ناموں پر ہو۔ جو ظاہر میں تو میرے گھرانے کے دو پرانے ملازموں کے نام ہیں۔ مگر حقیقت میں ان دو وفادار انسانوں کے نام ہیں۔ جو ہمارے گھر میں نوکر کی حیثیت سے آئے۔ اور جب گئے، تو اِس طرح کہ ہمارے سارے گھرانے نے یہی سمجھا۔ کہ اُس کے دو سر پرست اُٹھ گئے۔ بابا بُلھا اور بابا امام الدین کی خدمتوں کا صلہ صرف محبّت ہی ادا کر سکتی تھی۔ اور مجھے اپنے گھرانے کی شرافت پر

ناز ہے، کہ یہ صلہ اِس گھرانے کے بچّے بچّے نے ادا کیا۔ بابا بُلھا آج ہمارے خاندان کے قبرستان میں میرے باپ اور اپنے آقا کے قدموں میں سو رہا ہے۔ اور بابا امام الدین پاکپٹن شریف میں حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی اولاد کے مقدّس قبرستان میں اپنی آخری آرامگاہ پاکر اُس سعادت سے ہم آغوش ہے جو بڑے بڑے شہنشاہوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدہ آغاز انجامم نگر

علی گڑھ کالج

۱۹۰۹ء میں جب مَیں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ تو میرے بزرگ میرے مستقبل کے متعلق آپس میں مشورے کرنے لگے۔ ہمارے خاندان کے دیرینہ کرم فرما سردار محمد اسمٰعیل جان جو اُن دنوں حکومتِ کابل کی طرف سے ہندوستان میں سفیر اور لاہور میں مقیم تھے۔ میری ہوشمندی اور ارادت سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے بہ کمالِ مروّت

یہ مشورہ دیا۔ کہ مجھے کابل بھیج دیا جائے۔ کابل میں اُن کا اثر اور اقتدار ایسا تھا۔ کہ وہ افغانستان میں میرے اکتسابِ علم و ہنر اور بعد میں میرے لئے کسی معقول سرکاری ملازمت کا آسانی سے انتظام کر سکتے تھے۔ ابھی سے کابل بھیجنے کی علّتِ غائی یہ تھی۔ کہ کسی نوعمر ہندوستانی لڑکے کا کابل میں جاکر افغانی رعایا بن جاتا۔ اور رفتہ رفتہ حکومت کا اعتبار حاصل کر لینا زیادہ آسان تھا۔ یہ تجویز دیکھنے کو بڑی خوش آیند تھی۔ مگر حکیم امین الدین کی محبّت نے اِس بات کو پسند نہ کیا۔ کہ ان کے خاندان کا اکلوتا وارث محض مرتبے اور دولت کے لالچ میں اپنے وطنِ مالوف سے باہر بھیج دیا جائے۔ اِس تامّل کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ میرے دونو عمزاد بھائی حکیم شہباز دین اور حکیم امین الدین ابھی تک اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ اور ان کے خاندان کی بقا کی امیدیں ایک میری ہی ذات سے وابستہ تھیں۔ اِس کے علاوہ ہمارا خاندان ابتدا ہی سے مناصبِ جلیلہ پر فائز اور اموالِ کثیر پر قادر ہونے کے باوجود استغنا کی نعمت سے کچھ اس درجہ بہرہ مند رہا ہے کہ ہمارے خاندان کے افراد کو ہمیشہ امیری کے طمطراق سے فقیری کی بے نیازی زیادہ بھاتی رہی۔ میرے جدّ امجد عبدالحمید انصاریؒ عرب فاتحانِ سندھ کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ اُس

وقت اُن کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ حاکم بھٹنیر نے اُن کو اپنی فرزندی میں قبول کیا۔ اور اُن کی شجاعت اور فراست سے خوش ہو کر اپنی ریاست کی حکومت اور قلعۂ بھٹنیر کی افواج کی قیادت ان کے سپرد کر دی۔ رفتہ رفتہ اِس نوجوان عرب نے سندھ کا بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ اُن کا مزار ملتان کے قریب تلبنہ میں ہے۔ اُن کی اولاد میں سے ہمارے ایک نامور بزرگ شیخ اسحٰاق گزرے ہیں جنہوں نے شہنشاہِ اکبر کے دربار میں بڑی عزت پائی۔ اور حکیم انتون مسیحی سے یونانی طبابت کا فن سیکھا۔ اُس دن سے آج کے دن تک طبابت ہمارے خاندان کا سرمایۂ امتیاز و اقتدار رہی ہے۔ انہیں کی اولاد میں سے ایک بہت باخدا اور نامور طبیب شیخ نور محمدؒ ہوئے ہیں۔ جو ضلع منٹگمری کے مشہور قصبے شیر گڑھ میں آ کر حضرت دیوان ماہرؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ انہوں نے شیر گڑھ کے دربار پُر انوار کا انتظام کچھ اس خوبی سے کیا کہ نواب امانت خان صوبہ دارِ لاہور اُن کے حُسنِ کارکردگی سے خوش ہو کر ان کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئے۔ اور صوبہ داری کے تمام فرائض اُن کے سپرد کر دیئے۔ شیخ نور محمدؒ کے پوتے حکیم عبداللہ مومنؒ انصاری جن کا ذکر ایچیسن کی مشہور کتاب "پنجاب چیفس" میں ہے۔ صوبۂ کشمیر

کے قاضی القضات اور بعد میں صوبہ دار لاہور کے دربار کے ایک معزّز رکن ہوئے۔ کچھ عرصے کے لئے میرے نامور جدّ امجد کشمیر کی صوبے داری پر اور بعد میں لاہور کی صوبے داری پر بھی فائز رہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں شاید ہی کوئی بڑا عہدہ ہو۔ جو ہمارے خاندان کے زیرِ تصرّف نہ رہا ہو۔ سکھّوں کے دورِ اقبال میں ہمارے خاندان کا اقتدار اور اثر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس تمام اقتدار اور اثر کے باوجود ہمارے خاندان کے افراد کا انکسار اور استغنار بھی ضرب المثل ہے۔ غرض مستقبل کی امیدوں کے سنہری نظارے میرے بزرگوں کی آنکھوں کو مسحور نہ کر سکے۔ مگر ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی زندگی کے وہ خواب جو میر فیض الحسن نے مجھے دکھا رکھے تھے۔ اور سر سیّد علیہ الرحمۃ کی قائم کی ہوئی اس علمی اور اسلامی درسگاہ کی دلکشی کے وہ نقشے، جو انہوں نے میری نظر میں جما رکھے تھے۔ ایسے بے حقیقت نہ تھے۔ کہ اب میرے اور علی گڑھ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو سکتی۔

میں ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج کی فسٹ ایر کلاس میں داخل ہو گیا۔ اور خوبیٔ قسمت سے مجھے سر سیّد رح کورٹ میں رہنے کی جگہ بھی مل گئی۔ اللہ اللہ یہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ کبھی آپ نے چراغ

کو بجھنے سے پہلے دیکھا ہے۔ وہ لَو بھی دیکھی ہے، جو خاموش ہونے سے پہلے شمع کے قلب و جگر سے اٹھتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ علی گڑھ میں اُس وقت مسلمانوں کے اقتدار کے چراغ کی یہ آخری بھڑک تھی۔ اور اسلامی تہذیب کی شمع کی آخری چمک۔ سرسیّد رحمۃ اللہ کے بعد نواب محسن الملک اور سیّد محمود اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور علی گڑھ کی عنانِ سیادت اِسلامی عظمت کے اس آخری سرمایہ دار کے ہاتھ میں تھی۔ جو وقارالملک کے لقب سے آج تک مشہور ہے اور جس کی خودداری، صمیمیت عزم، حق پرستی اور شریعتِ اسلامی کی پابندی، ہندوستان میں اسلام کا آخری وقار اور ملتِ اسلامیہ کا آخری اعتبار تھیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمدؔ بیرسٹرایٹ لا، جن کی صورت اور سیرت کی خوبیاں ملائیک فریب اور علی گڑھ کالج کے لئے جن کا ایثار ہماری قومی روایات کا طغرائے امتیاز ہے۔ بھیکم پور، چھتاری، دتاولی، بھاسو اور طالب نگر کے معزّز خاندانوں کے وہ تمام نامور افراد جن کی ذاتی سخاوتوں اور خاندانی فیاضیوں کا احسان علی گڑھ کالج کی گردن پر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مسٹر آرچ بولڈ علی گڑھ کالج کے پرنسپل جن کا نواب وقارالملک سے اصولی اختلاف اکبر کے اِس مشہور

شعر کا محرّک ہوا۔

کالج کے در پہ لکھ دے کوئی آبِ گولڈ سے
خم ہو سکے نہ سیکرٹری آرچ بولڈ سے

مگر جن کے علم کی عظمت کے آگے ہر مخالفت سرو رہ گریباں تھی اور جن کی شرافت کے سامنے ہر مخاصمت خانہ ویراں - جن کے اُس عشق پر جو اُن کو علی گڑھ کالج کے در و دیوار سے تھا، ہزار جذبِ کنعاں نثار، اور جن کی اُس محبّت پر جو اُن کو علی گڑھ کالج کے طلبہ سے تھی ہزار مہرِ یعقوب قربان۔ مولوی عبدالباقی کالج کے بر سر، پروفیسر ابوالحسن جو اُس زمانے میں نواب وقار الملک بہادر کے سیکرٹری تھے۔ ڈاکٹر ضیاالدین احمدؔ ریاضیات کے پروفیسر، ڈاکٹر ہارو وِٹس عربی زبان کے جرمن پروفیسر، مولانا عباس حسین السنۂ مشرقیہ کے اُستاد، پروفیسر ڈیوڈ اختر لونی سیّد محمود کورٹ کے اور پروفیسر ٹیوڈر ا وَن سر سیّد کورٹ کے پراوسٹ۔ مولانا سلیمان اشرف معلّمِ دینیّات۔ پروفیسر ریبنل اور پروفیسر پہ وِس۔ پروفیسر محمّد شفیع پروفیسر عبدالمجید، میر ولائیت حسین، ماسٹر قایم حسین اور ماسٹر جلال الدین غرض کِس کِس کے نام گنوائے جائیں۔ اُس وقت یہ آسمانِ علم و فضل روشن ستاروں سے بھرپور تھا۔ اور درخشاں نجوم و کواکب

سے مخمور۔

مسٹر محمد علیؒ (آکسن) اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علیؒ جو بعد میں اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے ہندوستان کی سیاسیات کے رہنما ہوئے سرکاری ملازمت کی پابندیوں کو اپنے حسب حال نہ پاکر اور اپنے اپنے بلند مرتبت عہدوں سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہو چکے تھے۔ مولانا شوکت علیؒ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے پھوس والے بنگلے کے قریب ایسوسی ایشن کے دفتر میں رہتے تھے۔ اور مسٹر محمد علی ممتاز ہاؤس کے قریب ایک چھوٹے سے کچے بنگلے میں اقامت گزیں تھے۔

یہ جگہ علی گڑھ کی سیاسیات کے ذکر کے لئے موزوں نہیں۔ تاہم اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ علی گڑھ کالج کی لیلےٰ کے کئی دیوانے تھے۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنے عشق صادق کا دعویدار اور اپنے جذب کامل کے اثر کا امیدوار تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمدؒ جن کو سرسیّد کی ذات سے دیوانہ وار محبّت تھی۔ اور جو نواب محسن الملک بہادر کے وقت میں اُن کے دستِ راست تھے۔ اپنی کوٹھی "آفتاب منزل" میں میر ولایت حسین کے ساتھ بیٹھ کر کالج کے انحطاط اور تنزل کا دکھڑا رویا کرتے تھے اور دن رات

اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کا تعلیمی اور سیاسی دستور اُس مقصد سے الگ نہ ہو جائے جو سر سیدؒ کا نصب العین تھا۔ مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی اپنی جگہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کی توجہ کے حقدار اور ایک نئے تعلیمی اور سیاسی نصب العین کے علمبردار بنے بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کا دستور اساسی کچھ اس سانچے میں ڈھل جائے کہ اُس کے طلبہ ہندوستان کی قومی تحریکوں اور اپنے وطن کے سیاسی ارتقا میں اُسی آزادی اور سرگرمی سے حصّہ لے سکیں جس آزادی اور سرگرمی سے دوسری اقوام کے طلبہ حصّہ لے رہے ہیں۔ اور ملک کے نظم و نسق کے معاملات میں برسرِ اقتدار آرہے ہیں۔ ادھر نواب وقار الملک اِن دو قوتوں کے درمیان جو لبسا اوقات متصادم بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ علی گڑھ کالج کی ناؤ کو اِس گرداب بلا سے بچانے میں دن رات ناخدائی کی وہ مصیبتیں جھیلتے رہتے تھے جن کا صحیح اندازہ صرف وہی ملاّح لگا سکتے ہیں۔ جن کی کشتی کو کسی ہلاکت خیز بھنور سے دوچار ہونا پڑا ہو۔

کالج کے طلبہ میں اُس وقت سیّد آلِ حسن اور سیّد احمد علی جو اپنے اپنے زمانے میں کرکٹ کے کپتان ہوئے۔ سیّد نور الدین ہاکی

کے کپتان، سیّد مسعود الحسن فٹ بال کے کپتان، ملک عبد القیوم یونین کے وائس پریزیڈنٹ، عبد الرحمٰن بجنوری، عبد الرحمٰن سندھی، محمد حاذق ڈائننگ ہال کے مستقل مانیٹر، ضیاء الحسن علوی، ظہیر الدین شمسی، فضلِ متین، محمد شعیب، سلام الدین خاں، خواجہ فیروز دین، لارڈ حیات قاضی مقبول حسن، ممتاز حسن خاں، ظہیر زاہدی، ضیاء الحق، استاد مقصود حسین، لارڈ اسحاق، کریم حیدر لودھی، شفقت، اشفاق اور بھوندو بڑی نمایاں اور گرانقدر اہمیّت رکھتے تھے۔ اُن کے کمرے فرقۂ باطنیّہ کے ملقوں کی طرح اُن کے ارادت کیش طلبہ کا مرجع بنے رہتے۔ مجھے ان سب کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ اور اپنی اپنی جگہ سب مجھ پر مہربانی فرماتے تھے۔

ہزہائینس نواب سر محمد حمید اللہ خاں موجودہ فرمانروائے بھوپال، نواب سر احمد سعید خاں جو بعد میں یو۔ پی کے گورنر ہوئے۔ اور اب حیدر آباد دکن کے مدار المہام ہیں۔ اور سر سکندر حیات خاں جو بعد میں پنجاب کے گورنر اور پھر اُسی صوبے کے پہلے وزیرِ اعظم ہوئے۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں اپنی نامور والدہ کے ایما کے مطابق جو اُس وقت سر بر آرائے بھوپال تھیں۔ اس سادگی سے زندگی

بسر کرتے تھے۔ کہ کبھی کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلا کہ وہ ایک عظیم الشان ریاست کے ولی عہد اور اس کے آیندہ تاجدار ہیں۔ مجھے اُن کے ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سر دسکندر حیات خاں تو ۱۹۰۹ء ہی میں انگلستان چلے گئے۔ اور صاحبزادہ احمد سعید خاں قریب قریب اُسی زمانے میں اپنی ریاست کے امور کے انصرام میں منہمک ہو گئے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خان کی تعلیم اور جسمانی تربیت کا قوام کچھ اِس طرح تیار کیا گیا تھا۔ کہ جہاں وہ لکھائی پڑھائی میں بہت ہوشیار تھے۔ وہاں ہر قسم کے کھیل کود میں بھی بڑے چاق چوبند تھے۔ اور اِسی وجہ سے انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بلا تامّل و تکلّف قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ علی گڑھ کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ اِس زمانے میں علی گڑھ کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان ہونا ایک ایسا اعزاز تھا۔ جو آسانی سے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اور جس پر جتنا بھی فخر کیا جاتا، بجا تھا۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں اتنے ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔ کہ سب انہیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ سب کے دوست تھے۔ مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے تھے۔ ایک

دن کا ذکر ہے۔ میں وِنسنٹ سمتھ کی لکھی ہوئی "تاریخِ ہندِ قدیم" پڑھ
رہا تھا۔ اور سانچی ٹوپ کا تذکرہ میرے زیرِ مطالعہ تھا۔ صاحبزادہ
حمید اللہ خاں اُس طرف آ نکلے۔ فرمانے لگے "تم سانچی ٹوپ' اپنی
آنکھوں سے دیکھ ہی کیوں نہ لو" میں نے کہا "سانچی ٹوپ ہے
کہاں؟ مسکرا کے فرمایا "اپنی ریاست میں!" میں نے کہا "ضرور
حاضر ہوں گا" ارشاد ہوا "تو وعدہ ہے۔ بھول نہ جانا" یہ بات
۱۹۱۱ء کی ہے۔ میں ۱۹۲۲ء میں بمبئی سے واپس آ رہا تھا۔ جب
بھوپال کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ تو بھوپال کا نام سُنتے
ہی میرا ذہن زمانۂ ماضی کی کئی منزلیں طے کر گیا۔ اور مجھے اپنا وعدہ
یاد آیا۔ جو میں نے اُس مملکت کے آئندہ تاجدار سے کیا تھا۔ میرے
ایک نہایت عزیز دوست اور پشاور کے رئیس آغا محمد وسیم جان
میرے رفیقِ سفر تھے۔ اُن سے بھوپال اُترنے کے لئے کہا۔ انہوں
نے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا۔ پھر عرض کر دوں گا۔ عابد میرا پرانا
ملازم میرے ساتھ تھا۔ اُس سے اسباب اتارنے کے لئے کہہ دیا
اِس وقت رات کے کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ گرمی کے موسم میں
بارش ہو رہی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ایک چھوٹا
سا ریسٹ ہاؤس اسٹیشن کے قریب موجود ہے۔ ہم دونو رفیقِ سفر

اور عابد بارش میں بھیگتے بھاگتے ریسٹ ہاؤس کی طرف چلے۔ یہ ریسیٹ ہاؤس اسٹیشن سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ گھُپ اندھیری رات اُس پر بارش اور پھر ہماری ناواقفیت۔ غرض بڑی مشکل سے ریسیٹ ہاؤس کے بیرے کا پتہ چلا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ یہ عمارت اُس زمانے میں کچھ خستہ حال سی تھی۔ کمرے میں گرمی، برآمدے میں بوچھاڑ۔ اُس پر قیامت یہ تھی کہ پلنگ کے گدیلے میں کھٹملوں کی بھرمار۔ کبھی اندر، کبھی باہر۔ غرض جوں توں کر کے رات کاٹی۔ صبح ہوتے ہی میں نے صاحبزادہ ولی عہد بہادر کو اپنی حاضری کی اطلاع پہنچانے کی غرض سے ایک عریضہ لکھا۔ اور اُسے بیرے کے حوالے کر دیا۔ کچھ یونہی سا ناشتہ کر کے میں اور آغا وسیم جان سو گئے۔ ناگہاں آنکھ کھلی۔ باہر ایک شور سُنائی دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھا۔ اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُس وقت میرے بدن پر صرف ایک بنیان تھی۔ اور میں پنجابی طرز کا تہمد باندھے ہوئے تھا۔ باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف سرکاری پیادے اور سپاہی دوڑ رہے ہیں۔ ایسے جیسے کسی بڑے بھاری مجرم کی تلاش ہو رہی ہو۔ سامنے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کے بلند قامت اور تنومند بزرگ فوجی وردی زیب تن کئے نظر آئے۔

ظاہری وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑے سرکاری عہدے دار یا فوج کے افسر ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا۔ وہ صاحبزادہ کرنل عبدالقیوم خاں علیا حضرت کے چیف آف دی سٹاف تھے کرنل صاحب کی زبان پہ یہی ایک جملہ برابر جاری تھا "میاں کے مہمان" "میاں کے مہمان"۔ بیرے نے میری طرف اشارہ کیا۔ کرنل صاحب نے مجھ سے کڑک کر پوچھا "میاں کے مہمان کہاں ہیں"۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگا۔ آخر کرنل صاحب نے وضاحت فرمائی "میں حکیم احمد شجاع سے ملنا چاہتا ہوں۔ میاں اُن کا انتظار فرما رہے ہیں۔ وہ میاں کے مہمان ہیں۔ اُن کے لئے میاں کا موٹر، اور اُن کے سامان کے لئے ٹرانسپورٹ کا ٹرک حاضر ہے"۔ اب جو میں نے اپنی ہیئت کذائی پہ نظر ڈالی۔ اور پھر اپنے استقبال کے سازوسامان کی طرف دیکھا۔ تو مجھے اپنی حالت پہ بڑا رحم آیا۔ میں نے سوچا۔ کہ اگر میں یہ کہتا ہوں۔ کہ میں ہی حکیم احمد شجاع ہوں تو میرے استقبال کے اس سارے اہتمام کی توہین ہوئی جاتی ہے۔ بلا تامّل مزید عرض کی "اطلاع کئے دیتا ہوں سرکار"۔ کمرے میں جا کر میں فوراً لوٹ آیا۔ اور عرض کی "فرماتے ہیں۔ کپڑے پہن کر حاضر ہوتا ہوں۔ آپ تشریف رکھیئے"۔ کرنل صاحب نے لیسٹ ہاؤس

کی ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھ گئے۔ آغا وسیم جان دروازے کی چک کے پیچھے کھڑے ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے آخر نہا دھو کر اور کپڑے پہن کر ہم دونو باہر نکلے۔ اب جو کرنل صاحب نے مجھے دیکھا۔ تو حیران ہو گئے۔ مگر زمانے کے اِس ہر دو گرم چشیدہ شریف انسان نے نہ اُس وقت جتایا۔ اور نہ پھر کبھی یاد دلایا۔ کہ اُس نے حکیم احمد شجاع کے ملازم کو پہچان لیا تھا۔

ہمارا سفر مختصر تھا۔ اِس لئے ایک ایک سوٹ کیس اور ایک ایک بستر کے سوا ہمارے ساتھ اور کچھ نہ تھا۔ مگر میں نے ٹرانسپورٹ کے ٹرک کی لاج رکھنے کے لئے عابد سے کہا۔ "تم سامان کے ساتھ آؤ"۔ رستے میں کرنل صاحب نے موٹر روک کر ہمیں بھوپال تال کا نظارہ دکھایا۔ اُس وقت ٹرانسپورٹ کا ٹرک ہمارے پاس سے گزر گیا۔ ٹرک بالکل خالی نظر آتا تھا۔ اور عابد ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھا۔ میں بہت خوش ہوا۔ کہ کرنل صاحب کی نگاہ اُس وقت تال کے پار مصروفِ سیر تھی۔

مہمان خانے میں پہنچے۔ تو دیکھا کہ میری خاطر مدارات کے ایسے اہتمام ہو رہے ہیں جیسے کوئی شہزادہ کسی شہزادے سے

ملنے آ رہا ہے۔ اُس وقت فطرت بھی اپنی ساری حسین کارفرمائیوں کے ساتھ اس منظر کو دلفریب بنانے میں مصروف نظر آتی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، شاداب سبزہ، کھلے ہوئے پھول، مہمان خانہ اُس وقت اِندر کا اکھاڑا نظر آتا تھا۔ اور ہر طرف سے صرف ایک ہی جملے کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ "میاں کے مہمان!" "میاں کے مہمان!" اس تواضع کی تفصیلات کے لئے جو میرے دو تین روز کے قیام کے دوران میں میرے سامنے آسائشوں اور نعمتوں کا خوانِ کرم بچھاتی رہی، یہ جگہ نہیں۔ مگر میں اِس بیان کو یہ کہے بغیر ختم نہیں کرنا چاہتا۔ کہ عزت و عظمت کا وہ زندہ پیکر جسے اُس کی رعایا "میاں" کے محبوب لقب سے پکارتی تھی۔ اور جسے ہم کالج میں صاحبزادہ حمید اللہ خاں کہا کرتے تھے۔ مجھ سے گیارہ برس کے بعد بھی اُسی سادگی، اُسی محبّت اور اُسی بے تکلّفی سے ملا۔ اور جب تک میں اُس کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے مجھے یہ بات یاد تک نہ آنے دی۔ کہ جس پرانے ہم جماعت سے میں اُس وقت ہم کلام ہوں، وہ اُس سرزمین کا آیندہ فرماں فرما ہے۔ بھوپال دیکھے اور تاجدارِ بھوپال کی مہمان نوازی کا لطف اٹھائے اب مدتیں ہوگئیں۔ لیکن جب کبھی اُس طرف کا دھیان آتا ہے تو حافظ کا یہ شعر زبان

پر جاری ہو جاتا ہے۔

گرچہ دوریم از لبساطِ قرب ہمت دور نیست
بندۂ شاہِ سمائیم و ثناخوانِ شُما

اُس زمانے میں علی گڑھ میں کچھ ایسے طالبِ علم بھی تھے جو بظاہر بہت خاموش نظر آتے تھے۔ مگر صاحبِ نظر دیکھ سکتے تھے کہ اُن کی اِس متانت کے پردے میں ارادے کی استواری اور طبیعت کی غیر معمولی صلاحیّت چھُپی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ملک عمر حیات جو آج کل اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ خان بہادر شیخ فضل الٰہی جو آج کل گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے پنجاب میں کنٹرولر آف سپلائز ہیں۔ شیخ عبدالحمید جو آج کل لاہور کارپوریشن کے چیف آفیسر ہیں۔ خان بہادر نوابزادہ امین اللہ جو آج کل نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ڈسٹرکٹ کمرشل آفیسر ہیں۔ شیخ محمد امین ایم۔ ایل۔ اے (پنجاب) جو آج کل ایک بڑے کامیاب اور مشہور بیرسٹر ہیں۔ خاں بہادر محمد زماں خان جو آج کل پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب ہیں۔ سیّد اسد محمد علی جو بعد میں ریلوے بورڈ کے ممبر ہوئے۔ ملک غلام محمد جو آجکل حیدرآباد دکن میں وزیرِ مالیات ہیں، کی شخصیتیں ایسی وقعت اور اہمیّت رکھتی ہیں۔ کہ اِن میں سے ایک ایک کے خصائل اور

کمالات کا بیان جداگانہ تبصرہ اور تجزیہ چاہتا ہے۔ مگر یہ جگہ اِن تفصیلات کے لئے نہیں۔ ان عزیز القدر دوستوں کے نام اِس لئے گنوا دئیے ہیں۔ کہ یہ تذکرہ اُن کے ذکرِ جمیل سے خالی نہ رہے۔

اولڈ بوائز کو جو اہمیّت علی گڑھ کالج میں حاصل ہے۔ وہ شاید کسی دوسری درسگاہ کے اولڈ بوائز کو حاصل نہیں۔ اِسی بنا پر مولانا شوکت علی اور مسٹر محمدؐ علی علی گڑھ میں رہتے تھے۔ اور اِسی بنا پر صاحبزادہ آفتاب احمدؐ، مولوی عبداللہ اور مسٹر تصدق حسین شیروانی نے علی گڑھ ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اِن کے علاوہ اکثر اولڈ بوائز جن میں سے کچھ کالج کے ٹرسٹی بھی تھے۔ وقتاً فوقتاً علی گڑھ کالج میں آتے رہتے تھے۔ اِن میں مسٹر ظفر عمر "نیلی چھتری" کے مشہور مصنّف، خان بہادر مولوی ظفر حسن۔ سیّد محمدؐ علی۔ سیّد علی حسن اور شیخ احسان الحق، جب کبھی آتے تھے۔ تو کالج کے طلبہ کی سرگرمیوں میں بڑی محبّت اور شفقت سے حصّہ لیتے تھے۔

احمدؐ بخش حجّام جنہیں سرسیّدؒ کے بال اور ناخن تراشنے کا فخر حاصل تھا۔ اب بھی اپنے اصلاحی کام میں بڑی چابک دستی سے مصروف رہتے تھے۔ جب وہ میرا خط بنانے آتے۔ تو خط بناتے بناتے اِن اولڈ بوائز کی ساری داستانِ حیات سُنا جاتے تھے

سوہن لال پوسٹ مین جب کبھی کسی اولڈ بوائے کو سر سیدؒ کورٹ میں دیکھ پاتا۔ تو اُسے اُس کے نام ہی سے پکارتا "ظفر میاں، احسان میاں آج آپ کا کوئی خط نہیں۔ کل آئے گا" خدا جانے وہ اِن اولڈ بوائز کو دیکھ کر کسی پرانے زمانے میں زندگی بسر کرنے لگتا تھا۔ یا اُس کا ذہن اِس حقیقت کو سمجھنے سے انکار کر دیتا تھا۔ کہ یہ اولڈ بوائز اب وہ لڑکے نہیں۔ جنہیں سوہن لال جانتا تھا۔ احمدؐ بخش اور سوہن لال جب تک زندہ رہے۔ علی گڑھ کالج سے وابستہ رہے۔ ان کی یہ وابستگی کچھ ایسی ہمیشگی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ کہ اب بھی ہم لوگ جب کالج میں جاتے ہیں۔ تو سر سیدؒ کورٹ کے برآمدے میں احمدؐ بخش کے ریزر تیز کرنے کی کھٹ کھٹ اور سوہن لال کے کھڑی والے جُوتے کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میں جب علی گڑھ پہنچا۔ تو سب سے پہلے اپنے بہنوئی دیوان سیّد محمدؐ کا تعارفی خط لیکر نواب وقار الملک بہادر کی خدمت میں حاضر ہوُا۔ نواب وقار الملک بہادر کو خواجگانِ چشتؒ کی بارگاہ سے بڑی عقیدت تھی۔ خط پڑھتے ہی سرو قد کھڑے ہو گئے۔

مجھ کو فرش پہ نہیں آنکھوں پر بٹھایا۔ پہلے مجھے اپنا مہمان ٹھہرایا۔ پھر کالج میں میرے داخلے کا خود ہی بندوبست فرمایا۔ جب تک میں علی گڑھ کالج میں رہا۔ نواب وقارالملک بہادر نے میری نگرانی ایک مبصّر سرپرست کی طرح فرمائی۔ اور میری تعلیم و تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا۔ جمعہ کی نماز سے پہلے جب وہ مسجد کے دروازے پر طلبہ کے استقبال کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ تو مجھے اپنا آدمی بھیج کر بلوا لیا کرتے تھے۔

صاحبزادہ آفتاب احمدؒ ولایت میں میرے بھائی حکیم امین الدین کے ہم عصر اور ہم جماعت تھے۔ بھائی کا خط لیکر جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو وہ مجھ سے اِس طرح ملے۔ جیسے کوئی اپنی بچھڑی ہوئی اولاد سے ملتا ہے۔ وہ مجھ سے فوراً ایسے بےتکلّف ہو گئے اپنے بچّوں کو بلایا، اور اُن سے کہا "بھائی سے ملو" انہوں نے اپنے گھر کے دروازے مجھ پہ اِس طرح کھول دیئے۔ گویا وہ گھر میرا گھر تھا۔ اور اُسکی تمام آسائشیں میری ہی منتظر تھیں۔ اُن کے بیٹوں میں شمشاد احمدؒ اس زمانے میں ولایت میں تھے۔ شہزاد احمدؒ کالج میں پڑھتے تھے۔ اور آباد احمدؒ اور خورشید احمدؒ اسکول میں۔ انیس احمدؒ ابھی بچّہ تھا۔ اُن کی ہمشیرہ کے بیٹے امیر احمدؒ اور طفیل احمدؒ بھی آفتاب منزل

ہی میں رہتے تھے۔ اس دودمانِ عالی کی مروت اور محبت کی یاد آج تک میری زندگی کا سرمایۂ نشاط ہے۔ شہزادا حمدؐ جو بعد میں ریاست گوالیار میں صوبے داری کے معزز عہدے پر فائز ہوئے اور خورشید احمدؐ جو آج کل اجمیر مارواڑ کے چیف کمشنر ہیں، ایسے دوست ہیں۔ کہ اگر ان کو اپنے جسم کی جان کہتا ہوں۔ تو اُن کی محبت کی توہین ہوتی ہے۔ اور اگر انہیں اپنی جان کی روح کہتا ہوں۔ تو میری محبت تسکین نہیں پاتی۔ غرض میں جب تک علی گڑھ میں رہا اُس گھر کی نوازشوں نے مجھے کبھی بھولے سے بھی یہ بات یاد نہ آنے دی۔ کہ میں گھر سے دُور ہوں، اور وطن سے باہر۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو مسلمانوں کے تعلیمی معاملات سے اس قدر شغف تھا۔ کہ اگر اُسے عشق کی دیوانگی کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ ہر روز صبح کے وقت متواتر دو گھنٹے تک آفتاب منزل کے برآمدے یا لان میں ٹہلتے رہتے اور اپنے کسی نہ کسی لکچر کی تیاری کرتے۔ اکثر مرتبہ ایسا ہُوا۔ کہ ہم لوگ انہیں اپنے آپ سے بڑی بلند آواز میں باتیں کرتے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ لبعد میں معلوم ہُوا، کہ وہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ ان کے کسی لکچر یا خطبے کی عبارت ہوتی تھی۔ جسے وہ اِس طرح ادا

کرتے تھے، گویا وہ اسے کسی مجمعِ کثیر کے سامنے ایک یگانہ اندازِ تخاطب سے پڑھ رہے ہیں۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وہ سر سیّد احمد خاںؒ کے نصب العین کے پیرو تھے۔ سر سیّدؒ کی سیاسی پالیسی کوئی رازِ سربستہ نہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ غدر کے بعد غدر کا سارا الزام ناحق ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ اور مسلمان جن کے سر میں ابھی تک حکومت کا خمار باقی ہے۔ اور علماء جن کی مذہبی عصبیّت اور قدامت پرستی اُن کو مغربی تہذیب کی نئی روشوں پر چلنے سے روک رہی ہے۔ اُن تمام عواقب و نتائج سے بے پروا ہیں۔ جو حکومت کی بے اعتباری اور غدّاری کے الزام کے جلو میں ناگزیر ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ جب تک مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری اقوام سے پیچھے ہیں۔ ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند رہیں گے۔ اور جب تک یہ دروازے بند ہیں۔ اُن کی اقبال مندی ایک امیّدِ موہوم، اور اُن کے اقتدار کی بحالی ایک ایسا خواب ہے۔ جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ۱۸۷۵ء میں انہوں نے ہندوستان کے مشہور نیک دل گورنر جنرل لارڈ لٹن کی تائید اور امداد سے علی گڑھ کالج کی بنا ڈالی۔ اِن کی نظر میں اُس وقت علی گڑھ کالج کی

تاسیس کے صرف دو مقصد تھے۔ ایک تو مسلمانوں کیلئے انگریزی
کی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام، اور دوسرے اس درسگاہ کے
فارغ التحصیل طلبہ کے لئے سرکاری ملازمت کا انتظام۔ صاحبزادہ
آفتاب احمدؒ اور ڈاکٹر سر ضیا الدین احمدؒ اسی مسلک کے پیرو اور
اسی نصب العین کے حامی تھے۔ مگر مولانا شوکت علیؒ اور مسٹر محمد علیؒ
جن کے دل میں کانگرس کی سرگرمیاں دیکھ کر آزادی اور حریت
کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے۔ اس بات کے آرزومند تھے
کہ علی گڑھ کالج کی تعلیم کا اب محض یہی مقصد نہ رہے۔ کہ وہ حکومت
کے لئے اچھے ملازم تیار کرے۔ اور مسلمان نوجوانوں کی فطرت
کی تعمیر اب اس ڈھنگ پر نہ ہو کہ وہ سرکاری ملازمت ہی کو
اپنی ترقیوں کی معراج سمجھیں۔ نواب وقار الملک کا مسلک اِن
دونو زاویہ ہائے نگاہ کے بین بین تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ علی گڑھ
کالج میں زمانۂ حاضرہ کے مقتضیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ
اسلامی دینیات کی تعلیم کا بھی کچھ ایسا بندوبست ہو جائے۔ کہ
علی گڑھ کالج کے طلبہ کی فطرت خالص اسلامی رنگ میں رنگ
جائے۔ سرکاری ملازمت کے وہ مخالف نہ تھے لیکن اُس
مغربیت کے دشمن ضرور تھے۔ جو علی گڑھ کالج کے طلبہ کی

سرشت میں رفتہ رفتہ رچ رہی تھی۔ اور اس صاحبیت کو بہ نظر پسندیدگی نہ دیکھتے تھے جو علی گڑھ کالج کے اُن فارغ التحصیل طلبہ میں نظر آتی تھی۔ جو محض علی گڑھ کالج میں تعلیم پانے کی بدولت بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ اُن کو حریت اور آزادی کے جذبے سے بھی نفرت نہ تھی۔ مگر وہ اُس رجحان اور میلان کے شدید مخالف تھے۔ جو مولانا شوکت علیؒ اور مسٹر محمدؐ علی کو کانگرس کی طرف لے جا رہا تھا۔ جب تک وہ علی گڑھ کالج میں برسر اقتدار رہے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اسی طرف مبذول رکھی۔ کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کی فطرت پر مغربی دہریت اور نیچریت کا رنگ نہ جمنے پائے۔ اُن کی زندگی اخلاقِ اسلامی کا عکس ہو۔ اور اُن کا ظاہر و باطن ہندوستان کی پُرانی تہذیب کا پَرتو۔

مختلف نظریات کی اس تمام کشاکش میں علی گڑھ کالج کے طلبہ کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ نئی تہذیب کی چکاچوند سے اُن کی آنکھیں خیرہ، مادیت کی افادیت سے ان کے قلب مسحور اور مذہب کے تصنع اور عبادت کے تکلف سے ان کی روح بیزار تھی۔ غرض اس تمام ذہنی جد و جہد کا وہی نتیجہ ہوا۔ جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ فطرتِ انسانی نہ کبھی کسی دستور و آئین کی

پابند رہی ہے، نہ رہے گی۔ ہر انسان کی طبیعت کی افتاد اُس کے انفرادی ماحول کا نتیجہ، اس کے عنصری تقاضات کا ثمر، اور اس کی ذاتی استعداد اور صلاحیت کا ماحصل ہوا کرتی ہے۔ اور پھر یہی طبیعت کی افتاد اس کی تقدیر کی معمار اور اس کے مستقبل کی مصوّر بن جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم میں سے بعض طلبہ کچھ تو اپنی فطرت کے تقاضے سے اور کچھ نواب وقار الملک بہادر کی مثال کی تقلید کی بدولت اور بعض محض اُن کی نظر میں قبولیت حاصل کرنے کی غرض سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔

ہم میں سے چند طلبہ ایسے بھی نکل آئے۔ جو مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی کا جی خوش کرنے کے لئے کانگرس کے پیروؤں کا سا لباس پہننے لگے۔ اور ہندوستان کے قومی ترانے سُن سُن کر سر دُھننے لگے۔ کسی کو مجھ سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ اِس زمانے میں ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد نے علی گڑھ کالج کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بیرونی رسوخ اور اپنے اندرونی اثر سے کام لیکر انہوں نے علی گڑھ کالج کے طلبہ کی ایک ایسی منظم جماعت

قائم کی۔ جوان دونوں قسم کی یورشوں کے سدِّ باب کے سلسلے میں علی گڑھ کالج کی سپر بن گئی۔ اِس جماعت کے طلبہ اُس زمانے میں خوشامدی، غدّار، غلام، حکومت پرست، نیچری، دہریئے اور نہ معلوم کن کن ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ مگر علی گڑھ کالج کی تاریخ شاہد ہے کہ اگر یہ لوگ اُس وقت چھاتی پہ پتھر رکھ کر سر سیّد کی اس عظیم الشان امانت کو جس کا نام علی گڑھ کالج ہے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔ تو علی گڑھ کالج یا تو دیوبند کے مدرسۂ دینیات کی ایک شاخ بن جاتا۔ یا شانتی نکیتن کا ایک اسلامی شعبہ۔

مَیں فسٹ ایر کے امتحان میں اپنی جماعت میں اوّل رہا۔ اور جونیر سکالر کے شرف سے مشرف ہُوا۔ خان بہادر چوہدری خوشی محمد اور خان بہادر ملک زمان مہدی کے بعد میں تیسرا پنجابی تھا۔ جسے یہ اعزاز نصیب ہُوا۔

اِس زمانے میں بہت سی مجلسی تحریکوں اور جغرافیائی زاویہ پسندیوں کے ردِّ عمل کے طور پہ علی گڑھ کالج میں پنجاب اور یو۔پی کے طلبہ کے درمیان بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ اِن بدگمانیوں نے آخر کار کھلی مخاصمت اور عملی مخالفت کا رُوپ دھار لیا۔ رُوپ دھار لیا مَیں نے اِس لئے کہا ہے۔ کہ یہ مخاصمت

اور مخالفت حقیقت میں محض چند فتنہ پرداز، کج نگاہ اور کور باطن لوگوں کا بنایا ہُوا ڈھانچ تھی۔ پنجاب اور یو۔پی کے طلبہ نے یہ ڈھانچ دیکھا۔ تو اُسے سچ مُچ اپنے اپنے دشمن کا قلعہ سمجھنے لگے۔ جس کو مسمار کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کے دشمن نظر آنے کی کوشش کرتے تھے۔ ملک عبدالقیوم ایک پنجابی طالبعلم کی وائس پریذیڈنٹی کا معاملہ ایک چنگاری بن گیا جس نے علی گڑھ کالج کی زندگی کے خرمنِ عافیت میں آگ لگا دی۔ یو۔پی کے طلبہ نے خود غرض اُمیدواروں کی اُکساہٹ سے عبدالقیوم کی مخالفت محض اس بنا پر کرنی شروع کر دی۔ کہ وہ پنجابی تھا۔ اِن کی دیکھا دیکھی پنجابی طلبہ نے بھی یو۔پی کے امیدوار کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ ایک لمبا اور دردناک قصّہ ہے۔ مگر اس آڑے وقت بھی ڈاکٹر سر ضیاالدین احمدؔ کی دانائی اور فرض شناسی کام آئی انہوں نے جونیر سٹوڈنٹس یونین کے نام سے ایف۔ اے کے طالبعلموں کی ایک جماعت مرتّب کی جو سنیر سٹوڈنٹس کے پھیلائے ہُوئے اِس زہر سے اُن نووارِدوں کو محفوظ رکھے۔ میں اِس یونین کا وائس پریذیڈنٹ مقرر ہُوا۔

الیکشن میں ملک عبدالقیوم کامیاب ہو گئے۔ کچھ دنوں تک

شکوہ شکایت کا بازار گرم رہا۔ آخر پرانے دوستوں اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والوں کی محبّت کی آنکھیں کھل گئیں۔ فتنہ پردازوں نے جو بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا رکھا تھا اُن کی آن میں گر گیا۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ اِس زمانے میں یو۔پی اور پنجاب کے طلبہ آپس میں بغل گیر ہو ہو کر داغ کا یہ مشہور مصرع پڑھتے تھے۔

"بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

مدّت تک کالج کے در و دیوار اِس مصرعے کی آوازِ بازگشت سے گونجتے رہے۔

یہ بات کچھ موزوں نظر نہیں آتی کہ علی گڑھ کالج کا ذکرِ جمیل ہو۔ اور محض ان متین اور سنجیدہ موضوعات ہی پر اکتفا کی جائے۔ علی گڑھ کالج کی زندگی کا وہ لطیف پہلو، جس کا تعلق طلبہ کے باہمی ارتباط سے ہے، وہ حسین اور دلفریب منظر ہے۔ جس کی یاد بادۂ دوشینہ کا خمار ہے اور بہارِ رفتہ کا سُرور۔ اِس لئے اگر اِس دورِ شباب کی بعض نادانیوں کا بیان بھی ہو جائے۔ تو اچھّا ہے۔

مجھے علی گڑھ لے جانے کے سلسلے میں جو لوگ محرّک ہوئے۔

اُن میں میرے دو پرانے دوست خواجہ فیروز دین اور حسن محمد حیات پیش پیش تھے۔ خواجہ فیروز دین خواجہ رحیم بخش کے صاحبزادے ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہ اب لاہور میں قانون کی پریکٹس کرتے ہیں۔ اور اُن کا شمار پنجاب کے مشہور اور بہت کامیاب بیرسٹروں میں ہوتا ہے۔ حسن محمد حیات میرے بھائی کے ایک بہت ہی عزیز دوست مولوی عبدالغنی سیشن جج کے بھانجے ہیں۔ اور آج کل بھوپال کی لیجسلیٹو کونسل کے سیکرٹری۔ میں جب علی گڑھ گیا تو شروع شروع میں انہیں دونوں دوستوں کی وساطت سے کالج کے نام برآوردہ طلبہ سے متعارف ہوا۔ جب تک میں کالج میں رہا یہ دونوں دوست میرے ہم جلیس اور ہمدم رہے۔ ان دو مخلص اور عزیز دوستوں کے علاوہ ملک عبدالقیوم بیرسٹرایٹ لا بھی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور جو آج کل پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج کے وائیس پرنسپل ہیں علی گڑھ کے قیام میں میرے لئے بڑی آسودگی اور خوشحالی کا وسیلہ بنے رہے۔ خواجہ فیروز دین، ملک عبدالقیوم اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ جب عبدالقیوم ولایت چلے گئے تو ممتاز حسن خاں ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ اِس بہانے

سے ممتاز حسن خاں کا تعارف جن مسرّت انگیز اور کیف پرور تعلقات کا ذریعہ بنا ان کا ذکر آگے آئیگا۔ اِس نوعمری کے زمانے میں میرے ان دوستوں نے جس نگہداشت، جس محبّت اور سچّی غمگساری کے ساتھ میری خبرگیری کی اس کی تفصیل مرہونِ بیان نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اِس عالمِ غربت میں ایک یتیم بچّے کی سرپرستی کے لئے خدا نے یہ رحمت کے فرشتے بھیج دیئے تھے۔ حسن محمد حیات، خواجہ فیروزدین اور ملک عبدالقیوم نے بڑے بھائیوں کی طرح میری حفاظت کی۔ ان دوستوں کے اثر اور رُعب کی بدولت میں بہت سی ایسی بلاؤں سے محفوظ رہا جو اکثر نوعمر اور ناتجربہ کار طلبہ کے سر پر منڈلاتی رہتی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ کپتان احمد علی کے ماموں جو آگرے میں طبابت کرتے تھے۔ اپنے بھانجے سے ملنے علی گڑھ آئے ہم لوگوں نے ان کی طبابت کی شہرت سُنی۔ تو اپنے اپنے دُکھ درد کی کہانی لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مجھے یہ شوق تھا کہ میری قوتِ حافظہ اِس قدر تیز ہو جائے کہ جو کچھ پڑھوں، ازبر رہے۔ جب میں نے اُن سے یہ ماجرائے شوق بیان کیا تو انہوں نے میرے لئے ایک شربت تجویز فرمایا جس کا

جزوِ غالب جہاں تک اس شربت کے رنگ سے پتہ چل سکتا تھا شاید زعفران تھا۔ اِس شربت کی تیاری پر کوئی دس روپے اُٹھے۔ دس روپے طالب علمی کے زمانے میں قارون کی دولت کی حیثیت رکھتے تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اتنی بڑی رقم اس شربت کی تیاری پر صرف ہوئی تھی۔ اور کچھ اِس وجہ سے کہ اِس شربت کے استعمال کے ساتھ میری قوتِ حافظہ کی بہت سی امیدیں بندھ گئی تھیں۔ مَیں نے یہ شربت بڑی احتیاط اور حفاظت سے رکھا۔ اور اسے بڑی کفایت اور نگہداشت سے پینا شروع کیا۔ شفقت جو اپنے وقت کے مشہور بولر اور کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔ اِن ہی دنوں میں آل انڈیا کرکٹ ٹیم کا میچ کھیل کر انگلستان سے واپس آئے تھے۔ وہ اگرچہ مجھ سے کوئی بیس برس بڑے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے میرے کلاس فیلو تھے اِس لئے نہیں کہ انہوں نے دیر سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ بلکہ اِس لئے کہ انہوں نے بیس برس تک ایف۔ اے کا امتحان کبھی پاس کر کے ہی نہ دیا۔ انہوں نے جب اِس شربت کے خواص کا چرچا سُنا۔ تو بن دیکھے اُس پر مر مٹے۔ اور سمجھے کہ یہی اکسیر اُن کی قوتِ حافظہ کا علاج ہے جس کی توانائی وہ

امتحان کے اکھاڑے میں کئی بار آزما چکے تھے۔ ایک دن میرے کمرے میں تشریف لائے اور مجھ سے اِس شربت کے متعلق پوچھا۔ میں اُن کی نیّت سے واقف نہ تھا۔ شربت کی تعریف کر بیٹھا۔ انہوں نے اُسے دیکھنے پر اصرار کیا۔ جب شربت کا زعفرانی رنگ دیکھا۔ تو اُس پر سوجان سے نثار ہو گئے۔ فرمایا۔ "ذرا ہم بھی اِس کے دو ایک گھونٹ پئیں"۔ میں نے عرض کی۔ "بِسم اللہ"۔ شربت پیا تو کہنے لگے "سبحان اللہ یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے اگر اس کا فائدہ بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا اس کا مزا ہے تو کیا کہنے۔ خیر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اور وہ دونو اکٹھے اینشنٹ ہسٹری کی کلاس میں جایا کرتے تھے۔ اینشنٹ ہسٹری کو وہ اُننٹ سنٹ ہسٹری کہتے تھے۔ اس لئے اس کی طرف کچھ زیادہ راغب نہ تھے۔ صرف حاضری لگوا کر کلاس سے باہر چلے آیا کرتے تھے۔ چونکہ اُن کی عمر اکثر پروفیسروں کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ اِس لئے ان سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ میں اب جو شربت پیتا۔ تو ہر روز یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا۔ کہ بوتل بڑی سُرعت سے خالی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا۔ کہ اس وقت جب میں اینشنٹ ہسٹری کی کلاس میں ہوتا تھا۔ تو بھائی شفقت

میرے کمرے میں آکر اپنی قوتِ حافظہ کو تیز کرنے کا سامان کیا کرتے تھے۔ اب میں حیران تھا کہ اس متاعِ نایاب کو جو کسی امیرزادے کی دولت کی طرح یار لوگوں کے ہاتھوں یوں رائیگاں لٹ رہی تھی۔ اِس دست بُرد سے کیسے بچاؤں۔ آخر ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ کالج کے ہسپتال کے ڈاکٹر شفاعت اللہ خاں مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ اور کونین کھانے کے فوائد پر اکثر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کونین کے باقاعدہ اِستعمال کے ارادے کا اظہار کیا۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑے۔ اور دس گرین روزانہ کے حساب سے دس دن کی خوراک سو گرین کونین میرے حوالے کر دی۔ کمرے میں واپس آتے ہی میں نے وہ سو گرین کونین کی پڑیا شربت کی بوتل میں الٹ دی۔ اور اُسے ہلا کر طاق میں رکھ دیا۔ اب جو دوسرے دن میں کالج سے اپنے کمرے میں آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ شفقت میرے بستر پر پڑے زور زور سے کراہ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اور ان کا ہاتھ ہے۔ کہ سینے پر اوپر نیچے برابر حرکت کئے جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے"! کہنے لگے تمہارا شربت پُرانا ہو کر زہریلا ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ آپ

کو کیسے معلوم ہوا" فرمانے لگے "آج اِس کا مزا ہی کچھ بدلا ہُوا ہے۔ زہر کی طرح کڑوا ہے۔ دو گھونٹ کیا پیئے۔ سینے میں آگ سی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ حلق میں انگارے رکھے ہیں۔ جب مَیں نے اُن سے کہا "کہ آپ اِن دو گھونٹوں میں کم سے کم پچاس گرین کونین نوش فرما گئے ہیں" تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے اور فرمانے لگے "ارے بیوقوف دو چار ہی روز میں تو میری شادی ہونے والی ہے۔ اور کونین کا تم جانتے ہی ہو۔ اعصاب پر کیا اثر ہوتا ہے"۔

بنگال کے ایک مشہور خاندان کے نورِ نظر سیّد شمس الہدےٰ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ اتنے سیدھے سادے نہ تھے۔ جتنے نظر آتے تھے۔ دولت کا لالچ ان کو اس درجہ تھا کہ وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتے۔ کہ کسی نہ کسی طرح بے شمار دولت اُن کے ہاتھ لگ جائے۔ اُن کی اِس کمزوری کا پتہ کہیں ظہیر شمسی کو چل گیا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ظہیر شمسی اپنے والد کے پاس شملے چلے جایا کرتے تھے۔ اور وہاں روز کالج میں مقیم ہُوا کرتے تھے اب کے ظہیر چھٹیوں سے کچھ روز پہلے ہی شملے چلے گئے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ مَیں کپتان احمد علی کے کمرے کی

طرف جا نکلا۔ اُن کے کمرے کے سامنے اکثر اُن کے دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ مگر آج اِس جمگھٹے کے انہماک کی کچھ اور ہی شان تھی۔ تپائی پر ایک اخبار رکھا تھا۔ جسے شمس الہدےٰ بڑے غور سے پڑھ رہے تھے۔ اُن کے اِردگرد احمدؐ علی، حیات، فیروز دین، حسن شاہ، مقصود حسین، علی احمدؐ اور مقبول حسن ایسے بیٹھے تھے۔ جیسے کسی آرمی ہیڈ کواٹر میں ملٹری سٹاف کے افسر آئندہ جنگ کے نقشے پر غور کر رہے ہوں۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں شمس الہدےٰ اس طرح چلّا اٹھے۔ جس طرح کوئی نیند سے چونک کر بڑبڑانے لگتا ہے "آکھیر شالا ہمارا کشمت بھی جاگا" احمدؐ علی نے اپنے مخصوص انداز میں ہونٹوں ہونٹوں میں مسکرا کر کہا۔ "اس میں کیا شک ہے" اُدھر سے مقصود حسین نے تائید کی "اب تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے"۔ شمس الہدےٰ نے پھر کچھ سوچ کر کہا "مگر یہ شالا چھوڑ کا بات ٹھیک نہیں" مقبول حسن پوچھنے لگے "کیوں" شمس الہدےٰ نے جواب دیا "ارے ہم شالا کالا ہے" احمدؐ علی نے بڑے استعجاب سے پوچھا "آپ کالے ہیں" اور پھر خود ہی جواب دیا "آپ تو سانولے ہیں سانولے" مقبول حسن زور سے چلّائے "سانولے

سلو نے" شمس الہدیٰ نے جواب دیا" مگر شالا ہمارا رنگ پھوٹو میں ہمیشہ کالا ہی آتا ہے" حیات بولے۔ اِس کا انتظام ہو جائے گا میں حیران تھا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ ذرا بڑھ کر چپکے سے حیات سے پوچھا۔ تو انہوں نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ اشتہاروں کے کالم میں ایک اشتہار تھا۔ جس کے اِرد گرد سُرخ اور نیلی پنسل سے اتنے خط کھنچے ہوئے تھے۔ کہ اچھّا خاصا چوکٹا بن گیا تھا۔ اشتہار کسی کریم بھائی ابراہیم بھائی کی طرف سے تھا۔ اور اس کی عبارت کچھ اس مضمون کی تھی۔

" بمبئی کے ایک متموّل تاجر کی اکلوتی بیٹی کے لئے کسی شریف مسلمان خاندان کے خوبصورت، پڑھے لکھے اور نوجوان صاحبزادے کے رشتے کی ضرورت ہے۔ لڑکی اپنے باپ کے کاروبار کی مختار، اور ان کے جز و کُل کی مالک ہے۔ سرسری اندازے کے مطابق وہ کوئی پچاس لاکھ روپے کی جائیداد کی وارث ہو گی۔ درخواست کے ساتھ فوٹو کا بھیجنا ضروری ہے"

ایک بار پھر جو پڑھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ سیٹھ کریم بھائی ابراہیم بھائی روز کاٹیج شملے میں رہتے ہیں۔ دماغ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ادراک و فہم کی بہت سی منزلیں طے کر گیا۔ اتنے میں چاروں

طرف سے تجویزیں پیش ہونے لگیں۔

"تصویر آگرے میں کھنچے تو زیادہ مناسب ہے"

"اجی نہیں۔ آغا حیدر کے والد ایسی تصویر کھینچتے ہیں۔ کہ مانی و بہزاد کو مات کر دیتے ہیں"

"ارے تصویر کو مارو گولی۔ پہلے درخواست کا مضمون تو لکھو"

"میری رائے ہیں اگر سیٹھ کریم بھائی کو پہلے علی گڑھ بلایا جائے اور ان کی خوب خاطر مدارات کی جائے۔ تو زیادہ مناسب ہو گا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے درخواستیں تو بے شمار آئیں گی"

"ارے بھئی! پچاس لاکھ کی جائیداد کا معاملہ ہے"

اتنے میں شفقت تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور ایک اندازِ تبختر سے فرمانے لگے "پچاس لاکھ روپے! ارے بھئی ان بمبئی والوں کے تو جہاز چلتے ہیں ہم جس جہاز میں ولایت گئے تھے۔ کیا عجب ہے۔ کہ انہیں سیٹھ صاحب کا ہو ظالم نے سارا جہاز ہمارے حوالے کر دیا اور لطف یہ ہے کہ کوڑی کرائے کی نہ لی"

شمس الہدیٰ کی باچھیں کھل گئیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے ہونے والے خسر کے جہاز میں بیٹھے بحرِ اوقیانوس

کی سیاحت فرما رہے ہیں۔ آخر یہ قرار پایا۔ کہ اِدھر تو درخواست اور فوٹو جائے۔ اُدھر سیٹھ کریم بھائی کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی جائے۔ اس کے بعد سیٹھ کریم بھائی کی خاطر مدارات کی تفصیلات پر بحث ہوئی۔ اور یہ فیصلہ ہُوا۔ کہ انہیں شہر میں مولوی حمیدالدین کے ہوٹل میں ٹھہرایا جائے۔ اور چونکہ یہ بات مناسب نہیں کہ ایسا عالی قدر مہمان تنہا کھانا کھایا کرے اِس لئے شمس الہدےٰ کے سب دوست ان کے ساتھ دونو وقت طعام میں شریک ہُوا کریں۔ مقبول حسن نے یہ تجویز بھی پیش کی۔ کہ جب سیٹھ کریم بھائی واپس شملے جائیں۔ تو شمس الہدےٰ اپنی بیوی کے لئے کوئی تحفہ ضرور بھیجیں۔ اِس پر شمس الہدےٰ بول اُٹھے "ماشاللہ اچھی شے بیوی" اِس پر سب کے سب بول اُٹھے "دریں چہ شک" تحفے کی نوعیّت کے بارے میں شمس الہدےٰ کو مقبول حسن کی یہ بات پسند آئی کہ فی الحال ایک درجن ریشمی رومال بھیج دیئے جائیں۔

چار پانچ دن کے بعد روز کا پنچ شملے سے شمس الہدےٰ کو اُن کے دعوت نامے کا جواب وصول ہو گیا۔ سیٹھ کریم بھائی اگلے ہی روز علی گڑھ پہنچ رہے تھے۔ شمس الہدےٰ کے احباب کی اُس دن کی سرگرمیاں ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتیں۔ دوسرے دن

سیٹھ کریم بھائی ایک شکرم میں بیٹھے سرسیّد کورٹ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اور ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ شکرم کی چھت اُن تمام بکسوں، سوٹ کیسوں، پورٹ مینٹوؤں اور ہولڈ آلوں سے لدی ہوئی تھی۔ جو شفقت اپنے ہمراہ ولایت سے لائے تھے۔ سیٹھ کریم بھائی پر جو نظر پڑی تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مولوی حمیدالدین ہوٹل والے سیٹھوں کا سا لباس پہنے ایک بڑی سی گول عینک لگائے۔ ہاتھ میں چھڑی اور چھتری تھامے سیٹھ کریم بھائی ابراہیم بھائی بنے بیٹھے تھے۔

اِس کے بعد جو کچھ ہُوا اُس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہم لوگوں نے تین دن تک شمس الہدے کے خرچ پر طرح طرح کے کھانے کھائے۔ اور جب شمس الہدے کی بیوی کے تحفے کی تقسیم ہوئی تو ایک ایک ریشمی رومال سب کے حصّے میں آیا۔ سیٹھ کریم بھائی کے واپس جانے کے بعد شمس الہدے بہت دن تک دولت کے خواب دیکھتے رہے۔ اور اپنی درخواست کے جواب کے منتظر۔ شاید یہ بھانڈا کبھی نہ پھوٹتا مگر اُن ریشمی رومالوں نے جو حسن شاہ، فیروز دین اور مقبول حسن جیبوں سے لٹکائے پھرتے تھے۔ چغلی کھائی۔ بے چارہ شمس الہدے

اب بھی کچھ نہ سمجھا۔ مگر اس کے بنگالی دوستوں نے اس تمام واقعے کی روئداد پرنسپل صاحب تک پہنچادی۔ وہاں سے یہ معاملہ نواب وقار الملک بہادر تک پہنچا۔ اور اس ناٹک کے چیف کیریکٹر ہیت دن تک اُن کی نظر میں معتوب رہے۔

آہ! اب وہ زمانہ کہاں۔ مگر اس کی یاد ہے کہ آج تک باقی ہے۔

خلید ن ہائے منقارِ ہما بر استخوان غالب
پس از مدت بیادم داد لذت ہائے مژگاں را

ڈاکٹر ڈانی کلف کیمسٹری کے پروفیسر جو بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل، اور پھر گورنمنٹ آف انڈیا کے چیف کیمیکل ایڈوائزر مقرر ہوئے، ان دنوں علی گڑھ کالج میں علمِ کیمیا کے شیدائیوں کے علاوہ فنِ تمثیل کے متوالوں کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ ناٹک کے تمام شعبوں سے ان کی واقفیت شہرۂ آفاق تھی اور ایکٹری کے فن میں تو وہ اس قدر طاق تھے، کہ یورپ میں بھی دور دور اُن کی مثال نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے ہم وارفتگانِ حسنِ شعر کو جو اس طرف مائل پایا۔ تو کالج کی اسٹیج پر شیکسپیئر کے کسی ایک ڈرامے کی تمثیل کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کے لئے شیکسپیئر کا مشہور

ڈراما ٹو ویلفتھ نائیٹ منتخب کیا۔ ملک عبدالقیوم، خواجہ فیروز دین، محمد شعیب قریشی، سیّد حسن شاہ اور مجھے بڑے بڑے پارٹ ملے اِس ڈرامے کے ساتھ ساتھ ہم نے اُردو کا کوئی ناٹک بھی پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اِس کے لئے ہماری نظرِ انتخاب آغا حشر کے مشہور ڈرامے صید ہوس پر پڑی۔ صیدِ ہوس بھی حقیقت میں شیکسپیئر ہی کے ڈرامے کنگ جان کا ہندوستانی ماحول کے ساتھ اُردو زبان میں ایک دلکش چربہ ہے۔ سیّد حسن شاہ نے نادر کا۔ خواجہ فیروز دین نے قزل کا اور میں نے ملکہ مہر عالم کا پارٹ ادا کیا۔ دونو ڈرامے بڑی کامیابی سے دکھائے گئے سب نے انہیں پسند کیا۔ مگر نواب وقار الملک بہادر تماشے کے دوران ہی میں اسٹریچی ہال سے اُٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہم یہ تماشے دوبارہ دکھانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے۔ کہ نواب وقار الملک بہادر کا حکم نامہ قضائے مبرم کی طرح ہمارے سر پر آدھمکا۔ یہ حکمِ امتناعی علی گڑھ کالج میں ہمیشہ کے لئے فنِ تمثیل کی موت کا حکم ثابت ہوا۔ اِدھر ہمارے ذوق و شوق کا گلا گھٹا۔ اُدھر پرنسپل صاحب کی طلبی ہوئی۔ اور اُن سے استفسار کیا گیا۔ کہ ایک اسلامی درسگاہ میں ایسے خلافِ شریعت فعل کی کیوں

اجازت دی گئی۔ اب ہم اور ہمارے پروفیسر ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے اور حیران تھے کہ اِس استفسار کے جواب میں کیا عذر پیش کیا جائے۔ آخر اس گناہ سے تائب ہونے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ اور جب تک ہم لوگ علی گڑھ کالج میں رہے۔ ہم نے بھولے سے بھی اس شوق کی تجدید کا ارادہ نہ کیا۔ کالج کے فنڈ سے اِس خلافِ شرع کام کے مصارف کی ادائیگی حرام قرار دی گئی۔ ہم نے بالآخر آپس ہی میں چندہ کر کے یہ مصارف ادا کر دیئے۔ اس وقت ہم لوگوں کے دل میں سر سیّد اور نواب محسن الملک بہادر کی رواداری اور وسعتِ نظر کی یاد تازہ ہو گئی جو خود فقیروں کا بھیس بدل کر اور بھکاریوں کا روپ دھار کر کشکولِ گدائی ہاتھ میں لئے شہر بہ شہر پھرتے تھے اور کالج کیلئے چندہ جمع کیا کرتے تھے۔

علی گڑھ کالج کے طلبہ کی اِن تعلیمی اور تفریحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اُس کے اربابِ حل و عقد کی سیاسی سرگرمیاں بھی اُسی طرح جاری تھیں جس طرح کسی سمندر کی خاموش اور ساکن سطح کے نیچے طوفاں خیز موجیں اُٹھتی رہتی ہیں۔ کالج کے نظم و نسق کے ذمّہ دار ایک طرف، اور اس کے اسٹاف کے سربرآوردہ اساتذہ

دوسری طرف اور پھر غضب یہ تھا کہ باہر کے وہ لوگ جو کالج کے انتظامی اور تعلیمی معاملات کے انصرام میں برسرِ اقتدار آنا چاہتے تھے تیسری طرف، شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے اور ہشیار اور عیّار شاطروں کی طرح کالج کے طلبہ کو شطرنج کے مہروں کی طرح حرکت دے دے کر ان کو اُن کی تعلیمی مصروفیتوں سے بیگانہ اور اپنے اصلی فرائض سے بے پروا بنا رہے تھے۔ بدقسمتی سے اس زمانے سے لے کر آج تک علی گڑھ کالج کی زندگی ان ریشہ دوانیوں کے جال سے آزاد نہیں ہوئی۔ اور وہ لوگ جن کے دل میں کالج کا درد ہے اور جو ایشیا کی اس عظیم الشان اسلامی درسگاہ کو صرف ایک منبعِ علوم و فنون ہی دیکھنا چاہتے ہیں اور جن کے دل میں یہ آرزو ہے کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کے شب و روز صرف علمی مذاکرات اور فنّی تحقیقات ہی میں صرف ہوا کریں، اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس علمی ادارے کو تعلیم و تعلّم کے سوا کسی دوسری تحریک کا مرکز نہ بننا چاہیئے، اور اس درسگاہ کے طلبہ کو تحصیلِ علم کے دوران میں اپنی توجہات کسی دوسری جانب منعطف نہ ہونے دینی چاہیئیں۔ سر سیّد کے بلند علمی معیار کا زوال اور علی گڑھ کالج کا انحطاط اسی پریشانیٔ خاطر اور عدمِ تعیّنِ مقصد

ہی کی کرم فرمائیوں کا مرہونِ منّت ہے اور ہماری تمنّا ہے کہ جس قدر جلدی ہمارا کالج ایسی تحریکوں اور مصروفیتوں سے دست بردار ہو جائے جن کا تعلق براہِ راست زمانۂ حاضرہ کے علم و فن کی توسیع اور مسلمانوں میں خالص اسلامی تہذیب کی تجدید و ترویج سے نہیں ہمارے حق میں اسی قدر بہتر ہے مسلمان اکابر کے ذاتی اختلافات اور تنازعات کی ہنگامہ آرائیوں کے لئے نہ تو مسلم یونیورسٹی کا کورٹ ہی کوئی موزوں جگہ ہے اور نہ اُن کی جنبہ داری اور فرقہ پرستی کے مظاہروں کے لئے مسلم یونیورسٹی کا دارالمعارف ہی کوئی مناسب مقام ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس گارے سے اِس اسلامی درسگاہ کی عمارت بنی ہے وہ مسلمانوں کے گاڑھے پسینے سے گوندھا گیا ہے اور جو اینٹیں اِس عظیم الشان تعمیر میں لگی ہیں اُن کے ایک ایک ذرّے کے ساتھ مسلمانوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اگر اس کے فطری میلانات یا اکتسابی رجحانات اِسلامی عقاید کے خلاف یا اسلامی ثقافت کے متضاد ہوں تو وہ مسلمانوں کی اِس قیمتی وراثت کی فضا کو اُس زہر سے مسموم کر دے جو

دہریت اور مادیت کی باطل فروشیوں کی بدولت اس کی سرشت میں رچ رہی ہے۔ میں نے اس مذموم میلان کا اثر علی گڑھ کالج میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا ہے کہ ہم جن بچوں کو اس توحید کے گہوارے میں پھولنے پھلنے اور اسلامی شرف کے اس چشمۂ آبِ حیات سے سیراب ہونے کے لئے بھیجتے ہیں وہ بعض کوتاہ فہم، تنگ ظرف اور کج نگاہ دعویدارانِ علم و فضل کے سکھلائے ہوئے غلط نظریوں کے باعث اُن تصوّرات سے یکسر بیزار ہو جاتے ہیں جو اسلام کی سب سے زیادہ قیمتی امانت اور مسلمانوں کی سب سے زیادہ بیش قرار وراثت ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ پر ایمان رکھنا اور اُس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا اسلام کا سب سے بڑا آئیڈیل ہے۔ اور دہریّت اور مادیّت اِسی آئیڈیل کی بیخ کنی کے درپے ہے۔ اُس مردِ مومن کو جس کی آنکھ مایوسیوں کی تاریکی میں اللہ کی رحمت کو شمعِ ہدایت بنانا سیکھ چکی ہے اور جس کا دل اُس واحدِ قہّار کا آستاں بوس ہو کر اربابِ دولت و حشم کے دروازوں پر ناصیہ فرسائی سے بیزار ہو چکا ہے پھر مادّی افادیّت کی کثافتوں سے آلودہ کرنا اور خدائے واحد کے پرستار کو ظاہری جاہ و جلال کے کثیرالاشکال

اور مختلف الانواع دیوتاؤں کی پوجا سکھانا ایک ایسا گناہ ہے جس کا خمیازہ مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کو اٹھانا پڑے گا۔

میں عبادت کو محض ایک رسم اور ایمان کو محض ایک لباس بنانا پسند نہیں کرتا۔ مگر میں جانتا ہوں۔ کہ ایمان بھی ایک علم ہے جو سیکھنے ہی سے آتا ہے۔ اور عبادت بھی عرفان کی وہ منزل ہے۔ جو تدبّر اور تفکّر ہی سے طے ہوتی ہے۔ اِس عالم کون ومکان کے تمام سانحات وحادثات کو اللہ کے حکم اور اُس کی مرضی سے منسوب کرنا، انسانی تدبیر کی مصلحتوں کی جگہ اللہ کے احکام کی حکمتوں پر ایمان رکھنا، عارضی تاثرات سے متاثر ہونے کی بجائے فطرت کے آئینِ مسلّم کے مطابق اپنی زندگی کا دستور العمل ترتیب دینا، گزشتہ اور موجودہ اقبال مند قوموں کے ہنگامی استقلال سے زیادہ اُن کے اعمال کے عواقب ونتائج سے عبرت حاصل کرنا، خرد کی ریشہ دوانیوں کو ترک کرکے اِس کائنات کے سچّے نظام کے سیدھے سادے گر سمجھنا، اور پھر اُن پر عمل پیرا ہونا، اور سب سے بڑھ کر اللہ کے مقرّر کئے ہوئے قوانین کو اپنی قسمت کا معمار اور اپنے آپ کو اپنے اعمال کا ذمّہ دار جاننا، یقیناً ایک ایسا مسلک ہے جس پر اسلام بجا طور پر ناز کرسکتا ہے اور جس

پر عمل پیرا ہونے سے آج بھی ہندوستان کے مسلمان اقبال مندی اور کامرانی کی وہ سعادتیں حاصل کر سکتے ہیں جو اُن کے نامور بزرگوں نے مختلف زمانوں میں اور مختلف ممالک میں اِسی مسلک پر عمل پیرا ہونے کی بدولت حاصل کیں۔ یقیناً اگر ہماری یونیورسٹی کے اربابِ بصیرت اسی مسلک کو ہر اُس تعلیم کا پس منظر بنا لیں۔ جو آج کل وہاں دی جا رہی ہے تو وہ حشر کے دن ہندوستان کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے سامنے، اور اپنے خدا کے حضور شرمسار نہ ہوں گے۔

غرض اس بصیرت کی بدولت جو مجھے بچپن ہی میں اُن صحبتوں کے فیض سے میسّر آ چکی تھی۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور جو میں نے اپنے نامور بزرگوں سے وراثت میں پائی تھی۔ میں نے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ اِس کی کیا وجہ ہے کہ وہ مسلمان نوجوان جو پانچ وقت مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ جو خدا کے فضل سے تمام اِسلامی شعائر کے پابند ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کے گھر پرورش پائی ہے اور جو ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے اُن تمام جذبات سے مشتعل ہو جاتے ہیں جو وقتاً فوقتاً عالمِ اسلام کو ہیجان میں لے آتے ہیں، جب آپس میں مل کر

بیٹھتے ہیں اور سلسلۂ گفتگو جاری ہوتا ہے تو کبھی اللہ کے کلام اور اللہ کے رسولؐ کی سیرت کا ذکر نہیں کرتے۔ اگر صلاح و فلاح کی منزل ڈھونڈی جاتی ہے تو نیٹشا، کانٹ، مل، بنتھم اور شاپن ہار کی دکھائی ہوئی راہوں سے، اور اگر حریت و آزادی کے سبق سیکھے جاتے ہیں۔ تو برٹیلا، دادا بھائی نوروجی، تلک، گوکھلے اور گاندھی کے لیکچروں سے۔ کیا اسلام کے مشاہیر کی زندگی اِن تمام فضائل سے عاری ہے۔ کیا اللہ کے کلام میں صلاح و فلاح کا کوئی رستہ نہیں۔ کیا پیغمبرؐ اسلام کی سیرت میں ایسے اوصاف نہیں کہ اِس زمانے کی مقتضیات کے کفیل ہو سکیں۔ کیا اسلامی عظمت اور شرف کی تاریخ اپنے آپ کو دُہرا نہیں سکتی۔ اور کیا اسلامی تہذیب میں ایسی کوئی صلاحیت موجود نہیں۔ کہ دورِ حاضر کے تمدّن کے معیار پہ پوری اُتر سکے۔ غرض اسی قسم کے سوالات تھے جن کے گرداب میں میری فکر دن رات غوطے کھاتی رہتی تھی کہ ناگہاں کلکتے کے مطلعِ انوار سے "الہلال" کی شعاعیں نمودار ہو کر ظلماتِ ہند کو روشن کرنے لگیں۔

ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے اوراق میں قرآن کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ قرآن کے سیاق

کو مدِّنظر رکھ کر اپنی عبارت کی طرح ڈالتے ہیں یا اُن کے حافظے میں قرآن اس قدر مستحضر ہے کہ جس مضمون پر بھی وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کے دعوے کی دلیل اور ان کے نظریّے کی تائید نصِّ قرآنی سے مل جاتی ہے۔

ادھر تو "الہلال" کی نور افشانیوں سے کفر و انکار کی ظلمتیں کافور ہونے لگیں۔ اُدھر پنجاب کی فضا اقبال کے اسلامی نغموں اور توحید کے ترانوں سے گونج اٹھی۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی جگہ "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا ترانہ اب بچّے بچّے کی زبان پہ تھا۔ منظور اور احمدؐ کمال جن کی آواز میں ایک خداداد سوز تھا۔ جب یہ اسلامی ترانہ گاتے تھے تو علی گڑھ کالج کے طلبہ اور اساتذہ کا تو ذکر ہی کیا، اس کے در و دیوار بھی وجد میں آجاتے تھے۔

اب مولانا شوکت علی اور مسٹر محمدؐ علی کی مجلسوں پہ ایک نیا رنگ جمنے لگا۔ حرّیت اور وطن پرستی کی جگہ، اسلام کے احیا اور مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ اب گرمیٔ محفل کا سرمایہ نظر آتا تھا اور تلک اور گوکھلے کی تقریروں کی جگہ اب اِن صحبتوں میں قرآن

کی آیات اور اقبال کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ میں نے خود مسٹر محمد علی کو یہ کہتے سُنا ہے۔ کہ میں نے قرآن ابوالکلام سے اور اسلام کا درد اقبال سے سیکھا ہے۔ مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی اس وقت سے لیکر اپنی اپنی موت کے وقت تک حقیقت میں انہیں جذبات سے سرشار رہے اور اس دوران میں جب کبھی وہ اِس راہ سے ہٹ کر کانگرس کی راہ پر چلنے اور ہندوستان کی آزادی کو اپنی منزلِ مقصود سمجھنے لگتے تھے تو وہ ایسا تھا۔ جیسے کسی کشتی کا ناخدا طوفان کے تھپیڑوں سے گھبرا کر اپنی منزلِ مقصود کا رُخ چھوڑ دے اور پناہ کے لئے کسی قریب کے ساحل پر اُتر جائے۔

اِن جذبات کا ردِّ عمل علی گڑھ کالج کے طلبہ پر بڑی سُرعت اور شدّت سے ہؤا۔ جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے جنگ بلقان کے دَوران میں ترکوں کی امداد کے لئے ہلالِ احمر کا ایک طبّی وفد ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ترکی لے جانا چاہا تو اس کے اراکین قریب قریب سب کے سب علی گڑھ کالج کے طلبہ ہی تھے۔ اور نمازِ جمعہ کے بعد کالج کے طلبہ مسجد سے باہر آتے ہوئے یہی ترانہ الاپتے سنائی

دیتے تھے۔

"لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل"

کالج کے طلبہ کے مختلف حلقوں میں اب "الہلال" کے پرچے سبقاً پڑھے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ قرآن ایک بھولا ہوا سبق تھا جو یک لخت یاد آگیا۔ اور جب یاد آیا۔ تو اِس ڈر سے کہ کہیں یہ سبق پھر یاد سے محو نہ ہو جائے۔ اس کو حافظے میں محفوظ رکھنے کی تدبیریں دن رات ہونے لگیں۔

میں نے قرآنِ مجید اپنی عمر کے چھٹے برس ہی میں ختم کر لیا تھا اور پھر اُس وقت سے لیکر اِس وقت تک اپنے خاندان کے معمول کے مطابق میرا بھی یہی دستور رہا کہ میں ہر روز نمازِ فجر کے بعد کلامُ اللہ کی ایک منزل پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس تلاوت کا مقصد محض ایصالِ ثواب تھا۔ اور اس فعل کی محرّک محض ایک اکتسابی عادت۔ میں نے اِس تمام عرصے میں زیادہ تر کلامِ مجید کا متن ہی پڑھا۔ اور وہ بھی جیسا عرض کر چکا ہوں، ایک قسم کی عبادت اور وظیفے کے طور پر۔

قرآنِ مجید میں نے مولانا شریعت علیؒ سے پڑھا تھا۔ وہ شیعہ تھے اور اُن کی شیعیت کا اثر مجھ پر بھی پڑا۔ اور اُس وقت

تک میرے عقاید پر یہ رنگ غالب رہا جس وقت تک تصوّف نے اپنی رنگ آمیزی سے اُسے پھیکا نہ کر دیا۔ عقائد میں جہاں تک اہلِ بیت علیہم السّلام کی محبّت کا تعلق ہے۔ شیعیت اور تصوّف میں کچھ بہت بڑا فرق نہیں۔ اسلام کے یہ دونو فرقے اہلِ بیئت کی محبّت کو وسیلۂ نجات اور جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ مگر شیعیت میں اہلِ بیئت کے خیالی مخالفوں کے لئے جو نفرت کا جذبہ موجود ہے، تصوّف میں اُس کی گنجائش نہیں سلسلۂ نظامیہ رح کے تصوّف کے علاوہ میرے عقائد پر جس چیز کا بہت گہرا اثر ہوا وہ سلسلۂ قادریہ رح کی شریعت پناہی تھی۔ حضرت سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہٗ جو محبوبِ سُبحانی اور محیّ الدین رض کے لقب سے تمام جہانِ اسلام میں مشہور ہیں۔ سلسلۂ قادریہ رح کے بانی تھے۔ خلفائے عباسیہ کے دورِ انحطاط میں انہوں نے بڑی جانفردستی اور جد و جہد سے شریعتِ اسلام کو ایک بڑی تباہی سے بچا لیا۔ یہ وہ تباہی تھی، جو باطنیّت اور اقبال مند سلاطینِ اسلام کی عیش پسندی کے سیلابِ فنا کے دامن میں پناہ لے کر شریعتِ اسلام کے استیصال کے درپے تھی۔ میرے بزرگوں کو حضرتِ محبوبِ رض سبحانی کی ذاتِ اقدس سے

والہانہ عقیدت رہی۔ ہمارے خاندان کے ہر گھر میں ہر ماہِ قمری کی گیارہویں تاریخ کو ختمِ قادریہؒ ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ خدا کے فضل و کرم اور حضرت رضؓ کے فیضِ تصرّف سے آج بھی میرے گھر میں جاری ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اولیاءِ کرام کا جذبِ کامل اپنے ارادتمندوں کے لئے ہمیشہ باعثِ تسکینِ قلب اور وسیلۂ ہدایت رہتا ہے۔ میں مُدّت سے قصیدۂ غوثیہ کا عامل ہوں اور ختمِ قادریہؒ میرا روزانہ وظیفہ ہے۔ اِن اَوراد سے جو فیض میں نے پایا ہے۔ اُس پر میری زندگی کی شادمانیاں اور کامرانیاں شاہد ہیں۔

شیعیت، تصوّف اور اہلِ سنت والجماعت کے تمام مختلف فرقوں کے عقائد کے مطالعے اور اُن کی تعلیمات کے صحیح فہم و ادراک اور سلسلۂ قادریہؒ کے اصول کی پابندی کا اثر میری طبیعت پر آخرکار یہ ہُوا۔ کہ میں نے اپنے لئے ایمان و عمل کی ایک نئی راہ نکال لی۔ میں اُس وقت سے اِس وقت تک اِسی راہ پہ چل رہا ہوں۔ اور اگر اعمال کا حُسن و قبح اُن کے نتائج سے پہچانا جا سکتا ہے اور اگر ایمان کی خوبی عمل کی راستی میں منعکس ہوتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہی راہ ہدایت کی راہ ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ میں قرآن کو اسلامی شریعت کا

تنہا ماخذ سمجھتا ہوں۔ ایسی حدیثوں کو جو اپنے تصوّرات اور اوامر و نواہی کی جزویات کے اعتبار سے قرآن کے متناقض اور مخالف نہ ہوں واجب العمل جانتا ہوں۔ سیّدِ کونین محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کا آخری پیغمبرؐ! قرآن کو اللہ کی آخری کتاب اور اسلام کو اللہ کا آخری مذہب مانتا ہوں۔ اہلِ بیت علیہم السلام کی محبّت کو حضور سرورِ کائنات کی محبّت کا جزو اور اپنی شفاعت کا سامان سمجھتا ہوں۔ صحابہؓ کرام کی عزت کو اُن کی اپنی عظمت اور اُس حُسنِ عقیدت کا خراج جانتا ہوں جو اُن کو حضورِ رسُولِ مقبول کی ذاتِ اقدس سے تھی۔ اور اُن کے افعال اور اقوال کو ہر تنقید سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ شریعت کی پابندی کو اسلام کے ہر فرقے کے وضع کئے ہوئے ارکانِ ایمان اور اُس کی تجویز کی ہوئیں اشکالِ اعمال پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور اگر کہیں شریعت اور طریقت متصادم ہو جائیں تو شریعت کے احکام کو صحیح اور طریقت کے اوہام کو باطل قرار دیتا ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں حنفی شریعت کا پابند اور سلسلۂ قادریہؒ اور نظامیہؒ کا ارادتمند ہوں۔ اور اُن اصول کے تحت جن کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے اِس مسلک کو اپنے لئے سرمایۂ ہدایت و نجات سمجھتا ہوں۔

میں نے عمر بھر کے تفکر اور تدبر کے بعد ایک بڑے عقدے کا یہ حل تلاش کر لیا ہے کہ اگر اسلام کے تمام فرقے اور مسلمانوں کے تمام طبقے اپنے اپنے امامِ شریعت اور اپنے اپنے پیرِ طریقت کے مسلک کو اِنہیں بنیادی اصول کا پابند کر دیں تو وہ نفاق اور اختلاط یک قلم دُور ہو سکتا ہے جو نظامِ اسلامیہ کے اتحاد اور مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

ایمان و عمل کے یہ نظریات تو بعد کے ہیں۔ مگر اُس زمانے میں قرآنِ مجید کے مطالعے کے دوران میں جب کبھی اُس کی آیات کے ترجمے پر نظر جا پڑتی تھی تو طبیعت کو اُس کی عبارت کے اسلوب اور الفاظ کے معانی سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہوتی تھی اور نہ قرآن کے ترجمے میں کوئی ایسی بات ہی نظر آتی تھی جس سے حقائقِ زندگی پہ کوئی خاص روشنی پڑ سکے۔ اب جو علی گڑھ کالج میں قرآنِ مجید کا چرچا ہونے لگا اور طلبہ بڑی کوشش اور کاوش سے کلام اللہ کی آیات میں تدبر کرنے لگے تو میرے دل میں بھی یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ قرآنِ مجید کے معانی اور مطالب سمجھنے کی کوشش کروں۔ اِس خیال کے پیدا ہوتے ہی میں نے قرآنِ مجید کے مختلف ترجموں اور تفسیروں کو

دیکھنا شروع کیا۔ جو آیات میری سمجھ میں نہ آتی تھیں، اُن پر میں ایک خاص نشان بنا دیتا تھا۔ اِن نشانات کی شکلیں مختلف تھیں اور ان کا منشا بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ میں نے دیکھا کہ بعض مقامات پر سیاقِ عبارت مدِّ نظر رکھتے ہوئے قرآن کے الفاظ کے معانی بالکل بے ربط اور ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ اور بعض باتیں خود قرآنی تصوّرات کے برعکس ہیں۔ بعض مطالب حقائقِ فطرت پر مبنی نہیں اور بعض معارف خود اپنی ذات میں سراسر متضاد ہیں قرآنِ مجید کے مطالعے کا یہ دَور کوئی چھ برس میں ختم ہوا۔ مگر اب جو دیکھتا ہوں تو مشکلات و موانع کا ایک سمندر ہے کہ میرے ذہن اور قرآنِ مجید کے صحیح فہم و تصوّر کے درمیان حائل ہے۔ ترجمے نے جو مشکلات پیدا کی تھیں تفسیر نے انہیں اور زیادہ مشکل بنا دیا۔ ترجمے میں تو صرف ایک لفظ یا ایک فقرہ ایسا ہوتا تھا جس کا اِدراک میرے فہم سے بالا ہو۔ مگر اس کی تفسیر تو انسان کی تمام استعدادِ ذہنی اور صلاحیتِ بشری سے بے پروا ہو کر مجھے ایک ایسی دنیا میں لے جانا چاہتی تھی جہاں ہم جیسے انسان ہی نہیں بستے، جہاں جو بات ہے فوق الفطرت اور خارقِ عادت ایک ایسی دنیا، جس میں بس ایک ہی قانون کا سِکّہ چلتا ہے

اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے متعلق جو کچھ کسی مفسر کی تفسیر اور مترجم کے ترجمے میں موجود ہے، صحیح ہے۔ اور عقلِ انسانی کو اِس بات کی اجازت نہیں کہ قرآنِ مجید کے ترجمے سے الگ ہٹ کر خود قرآنِ مجید کے متن پر غور کرے کہ یہ کام علمائے سلف کا حصّہ تھا جسے وہ تمام کر چکے۔ مگر جب میں قرآن کا یہ دعوے بار بار پڑھتا تھا کہ قرآن اِس لئے نازل کیا گیا ہے۔ کہ تم اِس میں غور کرو۔ تم اِس سے نجات اور فلاح حاصل کرو۔ تم اُس کے احکام کو اپنے اعمال بناؤ۔ تم اِسے پڑھو، اور اِس کی حکمتوں اور تدبیروں کو سمجھو۔ اور اگر کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو اپنی عقل سے کام لو۔ اور قرآن میں تدبّر کرو۔ تو مَیں حیران ہو جاتا تھا کہ آیا قرآن کی اِن ہدایات پر عمل کیا جائے یا عقائد و رسوم کی پابندی۔ اللہ اللہ! خدا خود تو یہ کہے "تم قرآن میں کیوں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا تمہارے دلوں کو تالے لگے ہوئے ہیں"۔ اور مسلمان اِس کھُلی دعوت کو سُن کر بھی شخصیّتوں اور عقیدوں سے مرعُوب ہو کر حیرت کی اُلجھنوں میں پڑا رہے!

مگر قرآنِ مجید کے اِس غائر مطالعے کے بعد ایک بات ضرور ہوئی۔ اور وہ یہ کہ قرآنی تعلیم کی روح کا حقیقی تصوّر یعنی

ایمان باللہ کی جزو بات میری سمجھ میں آ گئیں اور میں یہ حقیقت پہچان گیا کہ قرآن کی تعلیم کا مفہوم پرکھنے کے لئے صرف یہی ایک کسوٹی ہے اور جو چیز اِس پر کھری نہ اُترے، درست نہیں۔ لیکن جب اِس کسوٹی پر قرآنِ مجید کے مختلف تراجم اور تفاسیر کو پرکھا تو نظر آیا کہ قرآنِ مجید کے بعض الفاظ کے معانی سراسر اس تصوّر کے مخالف ہیں جو قرآن اللہ کی ذات کے متعلق ذہنِ انسانی میں قائم کرنا چاہتا ہے اور بعض معانی کی تہ میں ایسی بے حقیقت حقیقتیں ہیں جو افرادِ نسلِ انسانی کے ارتقائے ذہنی اور ان کے ارتفاعِ مدنی کے اُس پائے سے بہت پست ہیں جس پر قرآن اُن کو پہچانا چاہتا ہے۔ اِس جگہ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے دِل میں قرآن مجید کے مترجمین اور مفسّرین اور تمام علمائے سلف اور بزرگانِ دین کی بیحد قدر و منزلت ہے۔ قرآن مجید کے معانی کو اپنے اپنے زمانے کے مفہوم اور تصوّر کے مطابق مسلمانوں پر واضح کرنے کے ضمن میں جو کوششیں اور کاوشیں انہوں نے کی ہیں اُن کا صلہ صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ ہم تک جو اللہ کے دین کی نعمت پہنچی ہے یہ انہیں بزرگوں کی نیت کا ثمر اور محنت

کا نتیجہ ہے۔

اب میرے سامنے دو راہیں کھلی تھیں۔ ایک تو قرآن سے بے اعتنائی کی راہ جس پر چل کر مسلمان دین اور دنیا کی سعادتوں سے محروم ہو گئے اور دوسری تدبّر فی القرآن کی راہ جس پر چل کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان دین و دنیا میں سرافراز ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے دوسری راہ اختیار کی۔

پس جب میں اس نتیجے پر پہنچ گیا۔ کہ قرآن میں تدبّر مسلمان کا ضروری فرض ہے۔ اور جب قرآن کا متن محفوظ ہے اور عربی زبان ایک زندہ زبان ہے تو میں نے تمام تراجم اور تفاسیر کو ایک طرف رکھدیا۔ اور قرآنی تعلیم کا صحیح تصوّر مدِ نظر رکھ کر عربی زبان کی لغت اور محاورے کے مطابق قرآن کے معانی اور مطالب تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ اب اللہ کی توفیقِ رفیق سے ذہن پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ شوقِ طلب نے عشق کی صورت اختیار کر لی۔ اور تفکّر و تدبّر کی کاوشیں اور کامیابیاں، فراق اور وصل کی بیتابیوں اور مسرّتوں کا مزا دینے لگیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ تمام تحقیق سنہ ۱۹۳۰ء میں ختم ہو گئی۔ اور میں نے افصح البیان فی مطالبِ القرآن کی تالیف کا کام شروع

کر دیا۔ جو اللہ کے فضل سے ۱۹۴۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اِس دَوران میں گردشِ لیل و نہار کے ساتھ ساتھ میری زندگی نے کئی پہلو بدلے۔ اور فکر و عمل نے ہنگامی مطالبات اور وقتی مقتضیات سے مجبور ہو کر مختلف راہیں اختیار کیں۔ جس راہ پر بھی قدم اٹھا زمانے نے اپنی ساری سازگاریوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور روزگار اپنی تمام مساعدتوں کے ساتھ اُس کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ رہا مگر لڑکپن کی کوتاہ نظر نادانیوں کے عالم میں بھی اور جوانی کی ناعاقبت اندیش سرگردانیوں کے دَور میں بھی، مَیں نے اِس کام کی انجام دہی سے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اگرچہ دنیاوی جاہ و جلال کے قابلِ اعتنا درجات اکثر چشمِ التفات کے منتظر رہے۔ مگر مَیں نے آخرت کے درجات ہی کو اِس دنیا کے درجات سے افضل اور اُس دن کی سُرخروئی

اور کامرانی ہی کو سب سرخروئیوں اور کامرانیوں سے بہتر سمجھا جس دن بندے اپنے مالک کے حضور اپنے اپنے عمل کا دفتر لیکر حاضر ہوں گے۔ سرخروئی وہی ہے، جو اس دن نصیب ہو۔ اور کامرانی وہی ہے، جو اُس دن میسر آئے۔

اُنظُرْ کَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَکْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَکْبَرُ تَفْضِیْلًا ؕ

لاہور، دِلّی اور میرٹھ

سنہ ۱۹۱۱ء میں ایف۔ اے کا امتحان دے کر مَیں وطن واپس آیا۔ آغا حشر ان دنوں اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور میں مقیم تھے میں نے جب یہ سُنا کہ وہ لاہور میں موجود ہیں، تو بیتاب ہو گیا۔ شام کو اُن کی تلاش میں نکلا۔ جب مَیں نے وہ ٹوٹا پھوٹا مکان دیکھا جس میں حشر ایک تھیٹریکل کمپنی کا مالک اور ہندوستان کا سب سے زیادہ عظیم المرتبت ڈراماٹسٹ رہتا تھا تو مَیں سمجھا کہ میری آنکھوں نے کچھ دھوکا کھایا ہے۔ آخر کار مَیں نے رُک رُک کر اُس مکان کے دروازے پر دستک دی۔ ایک آواز جس میں شیرِ ببر کی گرج تھی، سُنائی دی "کون ہے"

مَیں نے جواب میں فقط یہی کہا "ایک مشتاقِ دیدار" جواب ملا "آجاؤ" اب میں اُس مکان کی رعشہ بر اندام سیڑھیوں پہ اس فخر سے چڑھ رہا تھا جیسے کوئی منزل ہفت خواں طے کر رہا ہو۔ چھت پر پہنچ کر دیکھا حشر ایک عجیب عالمِ کیف میں ایک فرسودہ تپائی کے سامنے بیٹھے ہیں شیشہ مے خالی ہے مگر وہ آتشِ سیّال جو اِس وقت سے پہلے اس شیشے سے چھلک رہی تھی اب اُن کی آنکھوں میں جھلک رہی ہے۔

حشر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ اور فرمایا "تم کون ہو بھائی، اور مجھ سے کیوں ملنے آئے ہو" مَیں نے شوقِ ملاقات کی داستان سنانی شروع کی۔

"دو برس گزرے۔ دِلّی میں" میری بات کاٹ کر فرمایا "دِلّی میں۔ ہاں! دو برس ہوئے مَیں وہیں تھا۔ تم نے مجھے دِلّی میں دیکھا ہوگا۔ مگر اب دِلّی وہ دِلّی نہیں۔ دِلّی حشر کے ڈراموں کی قدر کرتی ہے، حشر کی قدر نہیں کرتی۔ اِسی لئے لاہور آیا ہوں اِس شہر سے مجھے محبّت ہے۔ مَیں نہیں جانتا کیوں۔ تم لاہور ہی میں رہتے ہو" عرض کی "جی ہاں" فرمانے لگے "تو پھر مجھے تم سے بھی محبّت ہے مجھے اِس شہر کے در و دیوار سے محبّت

ہے۔ اس کے آسمان، اس کی زمین سے محبّت ہے!! یہ بے تکلّف اور بیباک اندازِ گفتگو ایک بادشاہ کا اندازِ گفتگو تھا، ایک شاعر کا اندازِ گفتگو تھا۔ ایک ایسے جوان بے پروا کا اندازِ گفتگو تھا۔ جو بات کرتے وقت نتائج اور عواقب سے بے خبر ہوتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ میں اور وہ پرانے دوست ہیں۔ ایسے دوست جو ایک دوسرے کی رُوح سے واقف ہوں۔ ایک دوسرے کے جذبات سے آشنا ہوں۔ ایک دوسرے کی پسند کو جانتے اور سمجھتے ہوں۔ یہ دوستی پورے پچیس برس اِس فراوانیٔ محبّت اور اِس صداقتِ جذبات کے ساتھ قائم رہی۔ جیسے میں جانتا ہوں یا حشر جانتا تھا۔

میرے بھائی حکیم امین الدین اس زمانے میں کچھ علیل تھے حشر ایک دن اُن کی عیادت کو آئے۔ دونو کو ایک دوسرے کی صحبت اور گفتگو کچھ ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ اب اُن کے شب و روز یکجا بسر ہونے لگے۔ اِن صحبتوں میں مجھ پر پہلی مرتبہ یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ حشر ایک خوش فکر شاعر اور ایک بے نظیر ڈراماٹسٹ ہونے کے علاوہ اِسلامی تاریخ اور دینیات کا ایک وارفتہ اور منتہی عالم ہے۔ اور اس کو مذہبی معاملات

سے اِس قسم کا شغف ہے جس قسم کا شغف کسی مردِ مجاہد ہی کو ہو سکتا ہے۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے مگر انگریزی عبارت کا مفہوم سمجھ کر اُسے اردو میں کچھ ایسے حسنِ ظاہری و باطنی سے آراستہ کر کے پیش کرتے تھے۔ کہ اُس کا غیر ملکی رنگ روغن نظر نہ آتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے وہ بھائی جان کو اپنا ڈراما سنا رہے تھے۔ حشر کو جن لوگوں نے اپنی تحریر پڑھتے اور اپنا کلام سناتے دیکھا ہے وہ اُس محشر ستانِ تکلّم کی حشر آرائیوں سے خوب واقف ہیں۔ جب وہ اپنا ڈراما سنا چکے۔ تو مَیں نے کہا۔ مجھے بھی اپنا شاگرد بنا لیجئے۔ فرمایا "کچھ لکھتے بھی ہو" عرض کی "جی ہاں" ارشاد ہوا "سناؤ" مَیں نے کچھ ٹکڑے اپنے لکھے ہوئے ڈرامے کے سنائے۔ اُٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور فرمایا "تم کو میری طرح لکھنا کس نے سکھایا" مَیں نے جواب دیا "آپ نے" فرمانے لگے۔ "تو آج سے تم ہمارے شاگرد ہو" حشر کی صحبت میں چھٹیوں کے تین مہینے آنکھ جھپکتے ہی گذر گئے۔ اور مَیں علی گڑھ واپس چلا گیا۔

اِس کے بعد مَیں نے استادِ مرحوم کو ۱۹۱۶ء میں دیکھا۔ اور وہ بھی ایک عجیب کیفیت اور حالت میں۔ مَیں حیدر آباد دکن

سے واپس آرہا تھا۔ صبح کی گاڑی سے لاہور اسٹیشن پر اترا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ سامنے وہیلر کی بک سٹال کے قریب ایک بڑے سے لکڑی کے بکس پر آغا حشر بیٹھے ہیں۔ وہ ظاہرا طور پر مغموم اور پریشان نظر آتے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی پانچ برس کی پیاس بھڑک اٹھی اور ۱۹۱۱ء کی صحبتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ اُٹھ کر بغلگیر ہوئے۔ میری حیرت کو شرمندۂ سوال نہ ہونے دیا۔ فرمانے لگے "سیالکوٹ میں کمپنی کا کام نہیں چلا۔ سب سامان وہیں ہے۔ بیوی بیمار ہے۔ اُس کے علاج کے لیے لاہور آیا ہوں۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا۔ کہ کرائے کے مکان میں ٹھہروں۔ یا کسی دوست کے ہاں" میں نے کہا "غریب خانہ حاضر ہے" انہوں نے فرمایا "بہت اچھا" وہ کوئی دو مہینے تک میرے غریب خانے پر فروکش رہے مگر بیوی کی علالت اور کمپنی کے کاروبار بگڑ جانے کی وجہ سے بہت پریشان رہتے تھے۔ بمبئی میں جب یہ خبر پہنچی۔ تو چاروں طرف سے بلاوے آنے شروع ہوگئے۔ حشر کی شہرت ایسی نہ تھی۔ کہ اُسے گاہک تلاش کرنا پڑتا۔ ملازمت تو اختیار نہ کی مگر ایک ڈرامے کا سودا کر لیا۔ آن کی آن میں اُن کی مالی

پریشانی دُور ہو گئی۔ اب وہ میرے مکان سے اُٹھ کر ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ یہ مکان جج صاحب کی حویلی کہلاتا تھا۔ اِس مکان میں ایک شہ نشین تھی۔ جس کے دروازے ایک گلی کی طرف کھلتے تھے۔ اسی میں ایک بخارچہ تھا جس میں ایک چھوٹی سی دری بچھی رہتی تھی۔ حسرت دن کا بیشتر حصّہ اسی بخارچے میں کاٹتے تھے۔ اُن کی نشست کا سامان بہت مختصر ہوتا تھا۔ ایک دری، ایک پنسل اور کچھ سادہ کاغذ۔ اِس زمانے میں اُن کے دوستوں میں سے حکیم فقیر محمدؐ اور مداحوں میں سے عبدالمجید سالکؔ ان سے ملنے اکثر آتے تھے۔ میں نے سالکؔ کو پہلی مرتبہ یہیں دیکھا۔ یہ اُس وقت بالکل نوعمر تھے۔ مگر ادب کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ اُن کی طبیعت کی جودت تنقید کی جرأت اور تخیّل کی ندرت جو بعد میں افکار و حوادث جیسی نادرِ روزگار چیز کی تخلیق کا باعث ہوئی اس وقت بھی اُن کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے عیاں تھی۔ ان سے میری واقفیت بعد میں دوستی کے مدارج طے کرتے کرتے بھائیوں کی سی محبّت میں تبدیل ہو گئی۔ ان لطیف صحبتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

حکیم فقیر محمدؒ ۱۹۰۹ء میں دِلّی کے طبیہ کالج سے طبابت
کی سند حاصل کر کے لاہور آئے تھے۔ پنجاب کے ایک
چھوٹے سے قصبے جگراؤں کے رہنے والے تھے۔ مگر اردو
زبان پہ کچھ اِس طرح شیدا تھے کہ مَیں نے انہیں کبھی اُردو کے
سِوا کسی دوسری زبان میں بات کرتے نہیں سُنا۔ فنِ طبابت میں
ان کو وہ دستگاہ حاصل تھی کہ دودمانِ شریف خانی کے
کوکبِ اقبال مسیح الملک حکیم محمدؐ اجمل خاں بھی ان کی ذکاوت، تشخیص
اور طریقۂ علاج کی تعریف کیا کرتے تھے۔ خطّاطی میں ان کو وہ
مِلکہ حاصِل تھا کہ مریض اُن کے نسخوں کا صحیح نستعلیق پڑھ کر ہی
رو بصحت ہو جایا کرتے تھے۔ مصوّری میں بھی ان کو بدرجۂ اتم مہارت
حاصل تھی۔ بڑے خوش لباس، بڑے ہنس مکھ، بڑے شیریں گفتار اور
بڑے ملنسار انسان تھے۔ مریض مرض لیکر ان کی خدمت میں حاضر
ہوتے تھے۔ مگر مرض سے شفا پاکر ان کی محبّت میں مبتلا ہو جاتے
تھے۔ ضلع جگت پھبتی میں استاد تھے۔ لیکن حفظِ مراتب کا اُن
کو اس قدر پاس تھا۔ کہ اپنی تحریر اور تقریر کو مناسب اور نامناسب
کی تمیز سے کبھی آزاد نہ ہونے دیتے تھے۔ جہاں ان کے
کمالِ فن نے لاہور کے ہر کہ ومہ کو ان کا شیدائی بنا رکھا تھا وہاں

اُن کے حُسنِ مذاق نے ہر با مذاق اہلِ قلم کو ان کا گرویدہ بھی کر رکھا تھا۔ اٹھائیس برس تک ان کا مطب ملجائے روزگار رہا۔ اور ان کی ذات مرجعِ اہلِ کمال ۱۹۰۹ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک جب یہ جالینوسِ زماں اور مسیحائے دوراں اس دنیا سے رخصت ہوا مجھے اپنی زندگی کے مختلف زمانوں میں مختلف حیثیتوں سے اُن کی نیاز مندی کا فخر حاصل رہا۔ پہلے مریض کی حیثیت سے، پھر ایک ایسے نیاز کیش کی حیثیت سے جس کو وہ اپنے بچّوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ جس سے وہ اپنے سب دوستوں سے زیادہ محبّت کرتے تھے۔ اور جس کی وہ بڑے بڑے امراء اور بڑے بڑے صاحبانِ علم و فن سے زیادہ عزّت کرتے تھے۔ ان کی موت سے علمِ طب ایک ایسے طبیب سے اور فنِ طبابت ایک ایسے ماہرِ فن سے محروم ہو گیا جس کا بدل اس زمانے میں مشکل، اور جس کا نعم البدل ہر زمانے میں ناممکن ہے۔

مشرقی دواخانہ قائم کر کے انھوں نے طبابتِ یونانی کی وہ کمی پوری کر دی جس کے باعث یونانی اطبّاء کے تجویز کئے ہوئے نسخے وزن کی قیود سے آزاد اور تاثیر سے محروم تھے۔ ہر دوا اس کے نام اور وزن کے مطابق اور ہر مرکب اس کے

اجزائے ترکیبی کے توازن اور تناسب کے ساتھ اگر کہیں مل سکتے تھے۔ تو اِسی دواخانے سے۔ مگر آہ! یہ دواخانہ بھی اپنے موجِد کے ساتھ معدوم ہو گیا۔

آغا صاحب کی بیوی کی بیماری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اور آخرکار اپریشن کی نوبت پہنچی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ جب ہم نے اُن کی رفیقۂ حیات کو سپردِ خاک کیا تو بہت دیر تک قبر کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر اپنی چھڑی سے قبر کے ساتھ کی زمین پر ایک مستطیل کا خاکہ کھینچا۔ اور کہا، "یہ حشر کی قبر ہے"۔ اِس کے بعد وہ بنارس چلے گئے۔ اُس زمانے سے لیکر ۱۹۳۴ء تک پھر مَیں نے اُنہیں نہیں دیکھا۔ ایک دو مرتبہ اُن کے خط تو ضرور آئے۔ مگر بہت مختصر اور کسی ضروری کام کے متعلق۔

۱۹۳۴ء میں ناگہاں یہ خبر ملی۔ کہ آغا حشر بہت زیادہ بیمار ہیں اور اپنے دیرینہ کرم فرما شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامیؒ کے ہاں تشریف رکھتے ہیں۔ یہ خبر سُنتے ہی مَیں حکیم صاحب کے ہاں پہنچا۔ اُس وقت کوئی چار بج رہے تھے۔ گرمی شدّت سے پڑ رہی تھی۔ اور حشر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ برف اور پنکھے

کا پرہیز تھا مگر پھر بھی برف کا پانی بار بار پیتے تھے اور پنکھے کے سامنے سے ایک لمحے کو نہ ہٹتے تھے۔ حکیم صاحب کی اجازت سے میں انہیں اپنی کوٹھی پر لے آیا۔ شاید شہر سے باہر کھلی فضا میں اُن کا جی بہل جائے۔

حکیم فقیر محمدؒ کے علاج اور پنجاب کی آب وہوا اور ایک نئے عزم کی گرمجوشی کی بدولت ان کی صحت جلدی بحال ہوگئی اپنی ذاتی فلم کمپنی 'حشر پکچرز' کے سلسلے میں اب وہ اس سرگرمی اور اتنی مستعدی سے کام کرنے لگے۔ کہ میں نے انہیں جوانی میں بھی اس طرح کام کرتے نہ دیکھا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمت اور طاقت کا تمام باقی ماندہ سرمایہ جو شاید ایک مدت تک ان کی زندگی کا کفیل ہوتا یک بہ یک بروئے کار آگیا اور ایک ہی برس میں ختم ہو کر رہ گیا۔ وفات سے دو روز پہلے یہ شعر کہا۔

کھو چکا جو جوشِ طاقت پھر ملے دشوار ہے
حشر اب صحت مری گرتی ہوئی دیوار ہے

حشر ایک درخشندہ آفتاب کی طرح افقِ ہندوستان پر چمکا۔ اور ایک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی تابانیوں کو اپنے ساتھ لیکر

گم ہو گیا۔ ۲۸ر اپریل ۱۹۳۵ء کو یہ سرمایہ دارِ سرور و کیف اور ہنگامہ آرائے عیش و نشاط اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حشر اسی مستطیل میں دفن ہیں جس کا خاکہ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں اپنی بیوی کی قبر کے سامنے کھینچا تھا۔ یہ اس نیک بخت بیوی کی محبت کا خراج تھا۔ یا حشر کے خواب کی تعبیر!۔

میں نے حشر کی زندگی کے مختلف دور دیکھے مگر جوانی اور بڑھاپے میں انہیں یکساں پایا۔ فطرتاً وہ بڑے خوش مذاق تھے اور عادتاً چھیڑ چھاڑ کے دلدادہ۔ بے تکلف دوستوں سے ان کی بے تکلفی اتنی تھی۔ کہ اکثر گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی تھی حکیم فقیر محمد، عبداللطیف تپش اور ان کے اپنے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کو اس بارے میں بڑی خصوصیت حاصل تھی۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا۔ کہ دوسرے کی بات ابھی ختم نہ ہونے پاتی تھی۔ کہ اُس کا برمحل اور برجستہ جواب مل جاتا تھا۔ غم اور فکر کو انہوں نے کبھی بھولے سے بھی اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ غالب کا یہ نظریہ۔ کہ

"غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا"

حشر کے طالعِ سعید نے باطل ٹھہرا دیا۔ وہ ہمیشہ غمِ عشق سے بھی

بے پرواہ ہے اور فکرِ روزگار سے بھی آزاد۔ وہ حسن کو تعریف سے جیتنا، اور اگر تعریف سے نہ جیتا جاسکے، تو دولت سے خریدنا خوب جانتے تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد اُن کا دِل عورت کی محبّت کو اس طرح تلاش کرتا رہا جس طرح ایک طائر جس کا نشیمن بادِ صرصر کے ناگہاں جھونکے سے برباد ہو جائے اپنے عارضی قیام کے لئے کوئی آسرا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ دولت کی قدر و قیمت سے اِس قدر بیگانہ یا شاید اس کے صحیح مصرف سے اس قدر واقف تھے کہ جب جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی تو قرض لیکر کام چلاتے۔ اور جب ہزاروں کے وارے نیارے ہوتے، تو دولت کو جا و بیجا لٹانے کے لئے ہزاروں غیر ضروری مصارف نکال لیتے۔ کون جان سکتا ہے یہ غیر ضروری مصارف اس دریا دل کے لئے کتنے ضروری تھے۔ ایک بات کی فکر البتہ ان کو ہر مہینے کے آخری دنوں میں ضرور بے چین رکھتی تھی تین چار سو روپے کی رقم کا ہر مہینے کے شروع میں اُن کی والدہ کے پاس بنارس پہنچ جانا ایک ایسی مد تھی جسے وہ کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ یہ رقم ان کے خاندان کی بیواؤں، یتیموں، اور غریب رشتے داروں کے لئے وقف تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی

ہُوا کہ یہ ماہانہ رقم بہم پہنچانے کے لئے انہیں اپنی ہیرے کی انگوٹھی اور گھڑی کی طلائی زنجیر گروِ رکھنی پڑی۔

خوشی رام ان کا پُرانا اور وفادار ملازم اس کل کا جسے حشر کہتے تھے ایک بہت بڑا جزو تھا۔ وہ اُن کی بیماری میں ایک تجربہ کار نرس کا کام دیتا تھا۔ افلاس کی حالت میں ایک ہمدرد غمگسار اور فارغ البالی کے زمانے میں حسابات کا ماہر بن جاتا تھا۔ ہاں ایک کام ایسا بھی تھا۔ جس کا انجام دینا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ جب آغا صاحب کی زبان میں گالیوں کا چٹخارہ چٹکیاں لیتا۔ اور ان کا کوئی ہم مشرب، ہم رتبہ اور بے تکلف دوست موجود نہ ہوتا۔ تو وہ خوشی رام ہی کو اپنا تختۂ مشق بنا لیتے ایسے جیسے کوئی دلدادۂ مے شرابِ صافی کی نایابی کے وقت کسی خانہ ساز عرق ہی سے جی خوش کر لیتا ہے۔

ایسا اُستاد آج کہاں ملتا ہے۔ جو شاگرد کی شہرت کو چار چاند لگانے کے لئے اپنی شہرت کو گہن لگا دے۔ ۱۹۲۱ء میں آغا حشر کلکتے کے مشہور و معروف میڈن تھیٹر سے کچھ دائمی سا تعلق قائم کر چکے تھے۔ اِدھر بمبئی کے تھیٹر والوں کی یہ حالت تھی۔ کہ سفید خون، صید ہوس، یہودی کی لڑکی، خوبصورت بلا،

آنکھ کا گناہ اور سور داس دیکھ چکنے کے بعد ان کی آنکھیں حشر کے ڈراموں کو ترس رہی تھیں۔ آغا صاحب کے پرانے قدردان کلکتے پہنچے۔ اور ان سے کہا۔ آپ اپنی پرانی کمپنیوں کے لئے بھی کبھی کبھی کچھ لکھ دیا کیجئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ میں دو مالکوں کی نوکری نہیں کیا کرتا۔ اور تمہیں میرے ڈراموں کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں۔ پنجاب میں میرا ایک شاگرد اب مجھ سے بہتر ڈرامے لکھنے لگا ہے۔ ان الفاظ سے اس پیکرِ مروّت نے میرا تعارف بمبئی کے تھیئٹروں کے مالکوں سے کرایا۔ اور یہ اِسی تعارف کی برکت تھی۔ کہ اردلیسیر دادا بھائی ٹھوٹھی، سہراب جی اوگرا، سہراب جی کانترک اور سیٹھ مہا بھائی جیسے صاحبانِ کمال نے مجھے اپنی اپنی کمپنی کے لئے ڈراما لکھنے کی دعوت دی۔ میرے اسلوب نگارش پر استاد کا رنگ کچھ ایسا چھا گیا تھا۔ کہ یہ "نظر باز" بھی تمیز نہ کر سکے۔ کہ ڈراما استاد کا لکھا ہوا ہے، یا شاگرد کا۔ آخر کار میری تحریر ان لوگوں کی کسوٹی پر پوری اتری۔ ایلفرڈ تھیئٹریکل کمپنی نے "باپ کا گناہ" اور اولڈ پارسی تھیئٹریکل کمپنی نے "بھیشم پرتگیا" کے ناٹک مجھ سے اتنی قیمت پر خریدے۔ جتنی قیمت حشر کے ڈراموں

کے سوا کسی دوسرے ڈراما لسٹ کے ڈراموں نے اب تک نہ پائی تھی۔ اس طرح آغا حشر نے مجھے تھیٹر کی دنیا سے روشناس کیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کا لکھا ہوا ڈراما یہودی کی لڑکی، کلکتے کے نیو تھیٹرز نے فلم کے لئے تیار کیا۔ یہ ڈراما اس قدر مقبول اور کامیاب ہوا کہ ادھر تو نیو تھیٹرز کو اُن سے ایک اور ڈراما لینے کی آرزو ہوئی۔ اور ادھر خود ان کو کمپنی بنانے کی ہوس۔ جب نیو تھیٹرز والوں نے بہت اصرار کیا۔ تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اسی شاگرد کا پتہ بتایا۔ اور یہ اس دوسرے تعارف ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ نیو تھیٹرز نے مجھ سے کاروانِ حیات کا ڈراما لکھوایا۔ اور اُسے پردہ سیمیں پر پیش کیا۔ کاروانِ حیات نے کامیابی اور مقبولیت کی جو منزلیں طے کیں ہیں اُنہیں استاد ہی کی کامرانی اور مرادمندی سمجھتا ہوں۔

اگر اسٹیج کی دنیا فلم کے ہاتھوں برباد نہ ہو جاتی۔ اور ان ماہرانِ فن کی زندگی کا دَور ختم نہ ہو جاتا۔ جو اس دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا پارٹ ادا کر کے ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے تو میرے اسٹیج کے ڈراموں کی تعداد اتنی مختصر نہ ہوتی

تاہم مَیں نے یہ شغل جاری رکھا۔ کچھ ڈرامے ہندوستان کی مجلسی اور معاشری زندگی کے متعلق لکھے۔ کچھ دنیا کے بڑے بڑے تاریخی واقعات کے متعلق۔ اِن میں آخری فرعون۔ مینا نقشوش اور تارا اِس لئے قابلِ ذکر ہیں۔ کہ پہلے ڈرامے کو اربابِ علم نے اور پچھلے تین ڈراموں کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے بہت زیادہ پسند کیا۔ نقادانِ فن اور صاحبانِ ذوق کی نگاہوں میں میرے لکھے ہوئے ڈراموں کی یہ قدر و منزلت بھی ہوئی۔ کہ اُنہیں ہندوستان کی بڑی بڑی نامی درسگاہوں کے عِلاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کی اسٹیج پر بھی تمثیل کیا گیا۔ اور ان کی تمثیل میں گورنمنٹ کالج کے موجودہ پرنسپل مسٹر گورو دت سوندھی، آل انڈیا براڈکاسٹنگ کے کنٹرولر سیّد احمدؔ شاہ بخاری، ہندوستان کے نامور ادیب سیّد امتیاز علی تاج، پنجاب کے مشہور تمثیل نگار دیوان آتما نند شرر اور اس ملک کے مایہ ناز ایکٹر مسٹر جگل کشور نے حصّہ لیا۔ فلمی دنیا میں کاروانِ حیات اُس کارواں کی جلو ثابت ہوا۔ جس کے عقب میں میرے لکھے ہوئے فلمی ڈرامے دھن وان، دو عورتیں، آنسوؤں کی دنیا، پریم یاترا اور صلاح الدین یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آئے۔ یہ کارواں ابھی تک جادہ پیما

ہے۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ جب تک میرے تخیل میں تخلیق کی قوت اور قلم میں روانی کا جوش ہے۔ اسی طرح شہرتِ عام اور قبولیتِ دوام کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔

مَیں نے ۱۹۳۴ء کے دسمبر کی ایک پُر لطف صحبت میں آغا صاحب کو "آخری فرعون" کے کچھ ٹکڑے سنائے۔ فرمانے لگے۔ "اب تمہاری تحریر کا رنگ میری تحریر کے رنگ سے بہت مل جل گیا ہے۔ تمہارے ڈرامے روز بروز میرے ڈراموں سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک دن حشر بن جاؤ گے۔ ڈراما ضرور لکھا کرو۔ اور دیکھنا میرا رنگ نہ چھوٹے۔ آخر میں یہی رنگ جمے گا۔"

اے کاش! آج وہ زندہ ہوتے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ کہ سب رنگ بدرنگ ہو گئے۔ اور آخر کار انہیں کا رنگ جما۔

علی گڑھ واپس آ کر مَیں تھرڈ ایر کی کلاس میں داخل ہو گیا۔ مضامین کے انتخاب کے وقت میری طبیعت کی دشوار پسندی نے ایک ایسا مضمون منتخب کیا۔ جس کی تعلیم کا کماحقہٗ انتظام ایک ایسی درسگاہ میں مشکل تھا۔ جہاں کوئی سنسکرت اور پالی کا

ماہر ہندوستان کی تاریخِ قدیم کا پروفیسر نہ ہو۔ اس لئے ہندوستان کی تاریخِ قدیم کے مطالعے کے سلسلے میں مجھے زیادہ تر اپنی محنت اور عرق ریزی سے کام لینا پڑا۔ یہ بات ایک حد تک میرے حق میں مفید بھی ثابت ہوئی۔ پکی پکائی ہنڈیا کھانا اور چیز ہے اور اپنی ہنڈیا پکا کر کھانا اور چیز ہے۔ دن رات کے مطالعے کی بدولت اِس مضمون سے میری واقفیت اتنی جامع ہو گئی کہ بعد میں جب مَیں نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ تو امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی مجھے میرٹھ کالج میں اِس مضمون کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی۔

مجھے علی گڑھ میں گئے کوئی دو تین مہینے ہی ہوئے ہوں گے۔ کہ گھر سے بھائی جان کی علالت کے عود کر آنے کی اطلاع ملی۔ وہ حقیقت میں ذیابیطس کے جانکاہ مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اور علالت کے یہ متواتر و مسلسل دورے اس کمزوری اور فقدانِ قوتِ مدافعت کی علامات تھے۔ جو اس نامراد بیماری کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ بھائی جان کے احسان ایسے نہ تھے۔ کہ مَیں اب اُن کی خدمت میں کوتاہی کرتا۔ خبر سُنتے ہی لاہور واپس آیا۔ دیکھا تو وہ بہت زیادہ کمزور تھے۔ کمزوری سے

زیادہ اُن کو اولادِ نرینہ نہ ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ خود طبیب تھے۔ اور جانتے تھے کہ یہ جان لیوا مرض جان لیکر ہی جائے گا۔ اِس لئے وہ تمام وسوسے جو ایک یقینی موت کے استقبال کے لئے وقت اور ضرورت سے پہلے پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دیتے تھے۔ یہ ایک ایسا روگ تھا۔ جس کا علاج کسی طبیب کے پاس نہ تھا۔ تسکینِ قلب اللہ کی مشیت پر ایمان رکھنے کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ اور اُس درد کا چارا کس کے پاس ہے جس پر انسان کے ارادے کا اختیار نہیں میں سمجھ گیا۔ کہ اُس دل کو جو اولاد کی محبّت کا پیاسا ہے۔ صرف میری موجودگی ہی تسکین دے سکتی ہے اور اُس دماغ کو جو نخلِ مراد کی برومندی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ صرف اسی کا نظارہ آسودہ کر سکتا ہے جسے انہوں نے ہمیشہ اپنا نورِ نظر سمجھا۔

ان کی اِس علالت کے دوران میں میں بار بار علی گڑھ گیا اور واپس آیا۔ دو بڑے اہم فرائض آپس میں متصادم تھے۔ آخر خون کے جوش نے خود غرضی پر فتح پائی اور طبیعت کی

شرافت مطلب پرستی پر غالب آئی۔ علی گڑھ کالج سے ڈسچارج سرٹیفکیٹ لے کر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گیا جب میں علی گڑھ سے رخصت ہوا۔ تو مجھے کبھی یہ اندیشہ نہ تھا کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے پھر علی گڑھ کالج میں رہنے کی مسرت نصیب نہ ہو سکے گی۔

یاد باد آنکہ خرابات نشیں بودم و مست
آنکہ در مجلسم امروز کم است آنجا بود

لاہور یوں تو میرا وطن تھا۔ اور یہاں کے سب لوگ دیکھے بھالے تھے۔ گورنمنٹ کالج کے اکثر طلبہ میرے پرانے اسکول فیلو اور دوست تھے۔ پروفیسروں میں کچھ ایسے بھی تھے۔ جو اس سے پہلے سنٹرل ماڈل اسکول میں میرے اُستاد رہ چکے تھے۔ اسکول کے زمانے کی میری ہر دلعزیزی کے باعث میں گورنمنٹ کالج میں نہ تو کچھ ایسا بیگانہ نظر آتا تھا۔ نہ ایسا ناخوش آیند۔ مگر علی گڑھ کالج نے دل پر کچھ ایسا جادو ڈال رکھا تھا۔ اور علی گڑھ کالج کے زمانے کے دوستوں کی یاد دل کو کچھ اِس طرح تڑپا رہی تھی۔ کہ نہ کالج میں چین آتا تھا۔ نہ گھر میں آخرِ کار خواجہ فیروز دین کو اِس جادو کا اُتار اور اِس بے چینی کا

علاج مل گیا۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا:" ہم ایسا کیوں نہ کریں۔ کہ میرٹھ کالج میں داخل ہو جائیں۔ میرٹھ لاہور سے اتنا ہی دور ہے، جتنا علی گڑھ سے۔ کوئی چھ سات گھنٹے کا سفر۔ جب جی چاہے لاہور آؤ۔ جب جی چاہے علی گڑھ چلے جاؤ"!

جب بھائی جان کی طبیعت اچھی طرح سنبھل گئی۔ تو میں نے اسی تجویز پر عمل کیا۔ خواجہ فیروز دین مجھ سے پہلے میرٹھ چلے گئے۔ اور میں بھی کچھ عرصے کے بعد میرٹھ کالج میں داخل ہو گیا۔ میں میرٹھ گیا تو میرے دو چار اور دوست بھی علی گڑھ سے میرٹھ چلے آئے۔ خواجہ فیروز دین، ظہیر شمسی، مقبول حسن اور میں یہاں بھی ایک کمرے میں اکٹھے رہنے لگے۔ میرٹھ میں جس چیز نے علی گڑھ کی تمام پر کیف مسرّتوں کی یاد بھلا دی۔ وہ مسعود حسین کمبوہ کی محبوب اور دلکش شخصیت تھی۔ مسعود حسین کمبوہ کو اس نام سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ مگر علی گڑھ کالج کے پرانے اور نئے طلبہ میں کوئی ایسا بھی ہے۔ جو مسعود ٹامی کے نام سے واقف نہ ہو۔ یہ وہی مسعود ٹامی تھے۔ جن کے دماغ کی جدّت آفرینیاں، جن کے تخیّل کی کار فرمائیاں، جن کی حرکات و سکنات

کی بوقلمونیاں اور خلوت و جلوت میں جن کی ہنگامہ آرائیاں علی گڑھ
اور میرٹھ ہی میں نہیں۔ بلکہ سارے یو۔ پی میں الف لیلےٰ کے افسانوں
سے زیادہ مشہور ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ مسعود ٹامی اور میرٹھ کے تحصیلدار
میں کرکٹ کے کسی میچ پر تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب
نے مسعود کو کالج کا ایک طالبِ علم سمجھ کر ذرا اپنی حکومت
کا رعب دکھایا۔ مسعود ایسے دن پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔
کہ کسی کا رعب مانیں۔ لیکن انہیں اب یہ فکر لگ گئی کہ کسی
نہ کسی طرح تحصیلدار صاحب کو نیچا دکھائیں۔ آخر اُن کو ایک
تدبیر سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے سر جیمس میسٹن کو جو اس زمانے
میں یو۔ پی کے گورنر تھے اور صوبے کے دورے کے سلسلے
میں میرٹھ آنے والے تھے۔ میرٹھ کالج کے مسلمان طلبہ کی طرف
سے ڈنر کی دعوت دے دی۔ سر جیمس میسٹن بڑے ہر دلعزیز
اور نیک دل انسان تھے۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔
دعوت کا انتظام مسعود کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ خان بہادر
شیخ وحید الدین اور خان بہادر شیخ بشیر الدین جو میرٹھ میں
بڑے بھیّا اور چھوٹے بھیّا کے نام سے مشہور ہیں۔ اُس

نامور باپ کے بیٹے ہیں جنہوں نے دِلّی کی جامع مسجد واگزار کرائی تھی۔ میرٹھ میں اُن کا دولت کدہ ہر غریب الدیار کا ملجا اور ہر حاجت مند کا آسرا ہے۔ شرافت ان کی کنیز اور مہماں نوازی ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ ان کی دولت صرف اِس لئے ہے کہ غریبوں کو امیر بنائے۔ اور ان کی شان و شوکت اِس لئے ہے کہ فقیروں کا رتبہ بڑھائے۔ اُن کی چشمِ التفات ہر کس و ناکس کے لئے وقف اور ان کا دل ہر دردمند کے درد کے لئے درماں بہ کف۔ ہم لوگ جمعے کی نماز انہیں کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ اور نماز کے بعد انہیں کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا خوانِ نعمت دن رات مہمانوں کے انتظار میں چشم براہ رہتا تھا۔ اِس لئے میرٹھ کالج کے مسلمان طلبہ کا ناگہاں ورود ان کی مہماں نوازی کے لئے کبھی موجبِ تردّد نہ ہوتا تھا۔ اللہ اللہ یہ لوگ کس تہذیب کی یادگار ہیں۔ فراوانیٔ دولت اِنہیں مائلِ تکبّر نہیں کر سکتی۔ ازدیادِ جاہ و حشم کے ساتھ ساتھ اِن کی گردنوں کا خم اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چھوٹوں پر اتنی شفقت کہ ادب کا دھوکا ہونے لگے۔ بڑوں کی اتنی عزّت کہ پرستش کا گمان ہو۔ گفتار میں ایسی شیرینی، کہ سننے والوں کے

کان حلاوت کی کان بن جائیں۔ رفتار میں ایسی نرمی، کہ زمین پہ پاؤں رکھیں۔ تو پاؤں کا نقش نہ جمے۔ آنکھوں میں آنسو، آواز میں رقت، کمر میں خم۔ مگر بات کے پکّے، ارادے کے دھنی۔ قول و قرار میں چٹان سے زیادہ اُستوار۔ بھنگی کو مہتر، حجام کو خلیفہ، سقے کو بہشتی اور نوکر کو بھائی کہہ کر پکارنا، گھر کی نوکرانیوں کو ماما اور بُوا کے نام سے یاد کرنا۔ پُرانی تہذیب کے اِن پرستاروں کی شرافت تھی۔ آہ! آج یہ چیزیں شریفوں کے گھروں میں بھی کمیاب ہیں۔ غرض یہ دونو جُود و سخا کے پیکر اور احسان و مروّت کے بندے اِس آڑے وقت مسعود کے کام آئے۔ ڈنر کا وہ اہتمام ہُوا کہ شاید و باید۔ مسلم ہاسٹل کے وسیع ہال میں بھیّا جی کی کوٹھی کا سب سامان آگیا۔ شاہ بلوط کی میزیں، ساگوان کی کرسیاں، چینی کے ظروف اور چاندی کے چھُری کانٹے۔ یونائیٹڈ سروس کلب میرٹھ نے کھانے کا مینو تیار کیا۔ اور اسی کے تجربہ کار خانساموں نے کھانا پکایا۔ اب ایک چیز کی کمی باقی رہ گئی تھی۔ مسعود کے پاس ڈنر کے کپڑے نہ تھے۔ آخر اُس کی تدبیر بھی ہو گئی۔ مسعود دِلّی گئے۔ اور مسٹر محمد علی کی طرف سے جو اُس وقت "کامریڈ" کے ایڈیٹر تھے۔

فیلپس کمپنی کو اپنے ایوننگ ڈریس کا آرڈر دے دیا۔

حاجعل کلام ڈنر کی نشستوں کی جب ترتیب ہونے لگی۔ تو بیچارے تحصیلدار صاحب کو میز کے آخری کونے میں جگہ ملی اور مسعود میز بانوں کے نمائندے کی حیثیت سے سر جیمس بیسٹن کے پہلو بہ پہلو بیٹھے۔ کھانا کھانے کے دوران میں ہم لوگ یہ دیکھ کر خوش اور پریشان ہوتے تھے۔ کہ مسعود بار بار سب کی آنکھ بچا کر تحصیلدار صاحب کو ذرا جھک کر آداب کر لیتے ہیں مسعود کے جذبۂ انتقام کی تسکین تو ہوگئی۔ مگر ڈنر کا بل بھیا جی کو اور ایوننگ ڈریس کا بل مسٹر محمد علی کو ادا کرنا پڑا۔

جب قیصرِ ہند تاجدار برطانیہ شاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کا دربار دِلّی میں منعقد ہوا۔ تو اِس جشن کو کامیاب بنانے کے لئے حکومت کی لامحدود طاقت اور رعایا کی لازوال وفاداری جو کچھ کر سکتی تھی، کیا گیا۔ ہم میرٹھ میں بیٹھے بیٹھے اِن تیاریوں کی داستانیں سنتے۔ تو دل مسوس کر رہ جاتے۔ ایسے جشن کی تقریبوں میں شریک ہونے کے لئے بڑے وسائل کی ضرورت تھی۔ اور اِس تقریب پر دِلّی کے ہنگاموں کا لطف اٹھانے کے لئے بڑا پیسہ چاہیئے تھا۔ یوں تو دِلّی میں ظہیر شمسی اور ممتاز حسن

کے مکان موجود تھے۔ مگر یہ دونو پُرانی دِلّی میں تھے۔ ایک چوڑی والوں میں دوسرا انڈیا محل میں۔

آخر دربار کے دن آگئے۔ ایک روز مسعود میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے "دِلّی کا دربار نہیں دیکھتے" میں نے جواب دیا۔ "اتنے پیسے کہاں ہیں" کہنے لگے "آخر کتنے ہیں" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو کل بارہ آنے نکلے۔ انہیں ہتھیلی پر رکھ کر کہا "ہمارے پاس تو یہ بارہ آنے ہیں" ہنس کر فرمانے لگے "ذرا بکس میں تو دیکھو" غرض کر کرا کے کل تیئس روپے بنے۔ مسعود نے کہا "بہت ہیں۔ تو تیار ہو جاؤ"

مسعود کا بدن اس قدر فربہ تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ معتبر معلوم ہوتے تھے۔ ان کا رنگ اِس قدر سُرخ اور سفید تھا کہ انگریزی لباس میں وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز نظر آتے تھے۔ انگریزی کا لہجہ اِس قدر فرنگیانہ تھا کہ ان کی گفتگو سے ان کا ہندوستانی ہونا کبھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ لباس دیسی ہو یا انگریزی، بہت شاندار پہنتے تھے۔ اور کھانا نہایت پُرتکلف کھاتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں اس ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ گویا بورڈنگ ہاؤس اُن کی جاگیر ہے اور وہ اس

کے انتظام کے لئے وہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے اپنے ملازم خیر محمؐد کو سفر کی تیاری کا حکم دے دیا۔

بورڈنگ ہاؤس سے چلتے وقت مسعود نے مجھ سے وہ تیئیس روپے لے لئے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر کہنے لگے "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اور جو کچھ میں کروں۔ وہی کرتے چلے جاؤ۔" میں نے کہا "بہت اچھا" میں نہیں جانتا۔ انہوں نے ریل کے ٹکٹ خریدے یا نہیں۔ مگر وہ دِلّی کی گاڑی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں جا ڈٹے۔ میں بھی ان کے ساتھ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ دِلّی کے کنگڑوے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی، تو اُترے اور خیر محمؐد کو انگریزی لہجے میں حکم دیا "بھوپال کیمپ میں جاؤ۔ اور مہمان خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ہمارا سلام بولو۔" خیر محمؐد "بہت بہتر حضور" کہہ کر چل دیا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کہنے لگے۔ "دیکھو بھئی! پیسے کم ہیں اور گاڑیوں کا کرایہ آج کل زیادہ ہے۔ اور سچ پوچھو تو سیر کا مزا پیدل چلنے ہی میں ہے۔ موسم بھی خوشگوار ہے اور چاروں طرف چہل پہل۔ ابھی پہنچ جاتے ہیں" میرے جواب کا انتظار کئے بغیر چل پڑے۔ کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

اِدھر اُدھر کی رونق دیکھنے اور اس پر جرح و نقد کرنے میں ہم اتنے مصروف ہو گئے کہ ہمیں یاد بھی نہ رہا۔ کہ ہم کہاں ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں۔ پانچ بجے کے قریب ہم "برج" کے سامنے والے بازار میں جا پہنچے۔ وہاں لپٹن کمپنی نے اشتہار کی غرض سے ایک خوبصورت شامیانہ سجا رکھا تھا۔ شامیانے کے نیچے قالین، اُس پر صوفے اور کرسیاں۔ اُن کے سامنے حسین و جمیل تپائیاں۔ اُن پر برّاق میز پوش۔ مسعود خدا جانے کیسے بھانپ گئے کہ یہاں چائے مفت تقسیم ہوتی ہے۔ فرمانے لگے "کیوں بھئی چائے پیو گے؟" میں نے کہا "چائے کا وقت تو ہے" فرمایا "تو پھر آؤ!" شامیانے میں جا کر ہم نے بڑے مزے سے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد مسعود نے بڑے سرپرستانہ انداز میں مینجر سے کہا۔ "انتظام بہت اچھا ہے" اس سفر کی ساری روئداد بیان کرنے کے لئے یہ جگہ کافی نہیں۔ بس یہ سن لیجئے کہ ہم نے ان تین روز میں کبھی تو لنچ اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن کے مہمان خانے میں کھایا۔ کبھی تاجدارِ رامپور کے مہمان خانے میں۔ ڈنر کبھی بھوپال کے کیمپ میں تناول کیا۔ کبھی بہاولپور کے کیمپ

ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ مسعود اِن سب والیانِ ریاست کے کیمپوں کے منتظمین سے واقف تھے۔ یا نہیں۔ مگر جہاں کہیں ہم گئے۔ ہماری ایسی آؤ بھگت ہوئی۔ کہ مجھ کو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ ہم کہیں بھی بِن بلائے مہمان نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اُن تئیس روپوں میں سے مشکل سے کوئی دس روپے صرف ہوتے ہوں گے۔ اِن میں سب سے بڑی رقم ڈھائی روپے کی تھی جس سے ہم نے چاکلیٹ کے دو ڈبے خریدے۔ باقی پیسے کچھ تو قلیوں کی مزدوری میں، اور کچھ ٹرام کے کرائے میں صرف ہوئے۔ ہاں یہ تو میں کہنا ہی بھول گیا۔ کہ بخش الٰہی اینڈ کمپنی کے منیجر سے مسعود کی پرانی یاد اللہ تھی۔ انہوں نے مسعود کو اپنی دکان سے سگریٹ خریدتے دیکھا۔ تو سٹر نہ سگریٹ کی پچاس ڈبیوں کا ایک پیکیٹ مفت نذر کر دیا۔

تیسرے روز ہم ان شاہانہ دعوتوں اور خاطر مدارات کے تکلفات سے تنگ آ کر دِلّی چلے گئے۔ میں مسعود سے رخصت ہو کر ممتاز کے ہاں مٹیا محل چلا گیا۔ اور مسعود اپنے ایک دوست کے ہاں فراش خانے میں۔

دوسرے دن حضورِ ملکِ معظم کو شہنشاہِ آں جہانی ایڈورڈِ ہفتم کے مجسمے کی نقاب کشائی کرنی تھی۔ ہیں ممتاز اور ظہیر زاہدی دوپہر ہی سے جامع مسجد کے سامنے امام صاحب کے بالاخانے پر جا بیٹھے۔ جب شاہی جلوس نکلا تو ہم سب یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ مسعود بجد شاندار لباس زیب تن کئے کسی بہت بڑے انگریز افسر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے جا رہے ہیں۔ بعد میں مجھے مسعود کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ روشن آرا باغ کی اس پارٹی میں بھی شریک ہوئے تھے جو والیانِ ریاست کی طرف سے حضورِ ملکِ معظم قیصرِ ہند کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ اور جس میں ملک کے چیدہ چیدہ اکابر ہی مدعو کئے گئے تھے۔

مسعود ٹامی کی زندگی کے کارنامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے عجیب و غریب اور اپنی دلکشی کے لحاظ سے ایسے کثیر الاشکال ہیں کہ اِس مضمون کا حجم اپنے اندر اُن کے بیان کی گنجائش نہیں پاتا۔ یہ ایک دو واقعات محض تبرکاً لکھ دیئے ہیں تاکہ مسعود کی روح جنّت الفردوس کی آسودگیوں میں اس درد سے تڑپ نہ اُٹھے کہ ہم اُسے اتنی جلدی بھول گئے

بلاشبہ یہ دُنیا ایک سرائے فانی ہے۔ اور اس میں جو قافلہ بھی ٹھہرا ہے وہ اسی لئے ٹھہرا ہے کہ رختِ سفر باندھے ہر وقت چلنے کو تیار رہے۔ مگر چلے جانے والوں کی یاد مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اور وہ دوست جن کے دم سے زندگی خوبصورت نظر آتی تھی، بھلائے نہیں بھولتے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

مسعود ٹامی، سیّد نورالدین، شفقت، سیّد صابر حسین، صاحبزادہ امیر احمد، سیّد اسد محمد علی، ظہیر زاہدی، نواب مسعود حسن اور برجیس حسن اپنے اپنے قافلے کے ساتھ راہیٔ عدم ہو گئے اور خدا جانے اور کتنے دوست بھی اپنا اپنا وقت پورا کر کے اس دارِ فنا سے چل بسے۔ اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ یہ سچ ہے۔ ہم آج دنیا کے دھندوں میں اُسی طرح مصروف ہیں جس طرح پہلے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ زندگی کے شب و روز گذرنے کو اب بھی گذر ہی جاتے ہیں۔ لیکن اب زندگی اس شراب کی مانند ہے جس میں کوئی سرور و کیف باقی نہ رہا ہو۔ اور زندگی کے لیل و نہار اس باغ کی مانند ہیں جس

سے بہار ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی ہو۔

دوسرے دن میں مسعود کی تلاش میں فراش خانے کی طرف جا نکلا۔ میری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے آپ کو ناگہاں فراش خانے کی گلی میں سکندر حیات خان کے بالمقابل پایا۔ وہ اُن کے بڑے بھائی نواب سر لیاقت حیات خاں اور اُن کی پارٹی کے دوسرے لوگ فراش خانے میں کسی نواب صاحب کے مہمان تھے۔ سکندر حیات مجھے اپنے ساتھ نواب صاحب کے دولتکدے پر لے گئے۔ وہاں میں نے میر مقبول محمود کو پہلی مرتبہ دیکھا اُس وقت ان کی عمر بچپن اور لڑکپن کے بین بین تھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اُس زمانے میں بھی مقبول محمود کی زبان کی طلاقت، ذہن کی ذکاوت اور آنکھ کی شرارت ایسی تھی۔ کہ ہر دیکھنے والا صاف سمجھ لیتا تھا کہ یہ فتنہ اپنے دامن میں ہزار قیامتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس وقت سکندر کے بڑے بھائی نواب اسلم حیات خاں کے بیٹے مسعود حیات بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اُن کی عمر اُس زمانے میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب

میں نے انہیں چاکلیٹ کی وہ ٹکیاں دیں جو مسعود کے خریدے ہوئے ڈبے کا آخری سرمایہ تھیں۔ تو وہ بہت خوش ہوئے یہ سارا دن میں نے سکندرہ کے ساتھ کاٹا۔ اور وہ حالات اور واقعات سنتا اور سناتا رہا جو فراق و مہجوری کے ان چار برس میں رونما ہوئے تھے۔ مسعود کو نہ ملنا تھا، نہ ملے۔ میں اور ظہیر شمسی واپس میرٹھ چلے گئے۔ دیکھا تو مسعود ہم سے پہلے ہی میرٹھ پہنچ چکے تھے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں میری ملاقات دِلّی کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ نواب غلام محمد حسن کے صاحبزادے ممتاز حسن خاں سے ہو گئی تھی۔ اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ میں جب کبھی علی گڑھ سے لاہور آتا تھا۔ تو وہ مجھے ضرور ایک دو روز کے لئے دِلّی میں اپنے دولتکدے پر ٹھہرا لیا کرتے تھے۔ ان کا مکان مٹیا محل میں ہے اور صدر الصدور کی حویلی کہلاتا ہے۔ غدر کے زمانے میں یہ حویلی مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور قاضی القضاۃِ ہند کی اقامت گاہ تھی۔ میں ممتاز حسن کے مکان میں اِس لئے بھی بڑے شوق سے ٹھہرا کرتا تھا کہ جو کمرہ انہوں نے میرے رہنے کے لئے مخصوص کر رکھا

تھا۔ اسی میں غالبؔ رہا کرتے تھے ممتاز حسن کے والد نواب غلام محمد حسن خان شاہِ عالم ثانی بادشاہ ہند کے دربار کے ایک معزز رکن کے پوتے اور غالبؔ کے مشہور ہمعصر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ والئے جہانگیر آباد کے داماد تھے۔ ان کے اوضاع و اطوار میں پرانی وضع داری تھی۔ اور رہنے سہنے کے طریق میں سرسیّد کے نئے تمدّن کا رنگ، انگریزی بوٹ، اس پر پتلون نما پاجامہ۔ قمیض اور ٹرکش کوٹ پہنتے تھے، سر پر ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ اپنی زندگی سادہ تھی۔ مگر گھر میں نوّابی کے ٹھاٹھ تھے۔ انگریزی اخبار پڑھنے کی عادت ان کی طبیعتِ ثانی تھی۔ اور صبح شام سیر کرنے کا شوق ان کی زندگی کا سب سے زیادہ دلکش مشغلہ۔ کبھی گاڑی پر سوار ہو کر جاتے تھے۔ کبھی پیدل۔ دِلّی میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ دن بھر کچہری کا کام کرتے اور عصر کی نماز کے بعد جائیداد کے حسابات کی پڑتال۔ مسلمانوں کا اِفلاس اور اِدبار اکثر اُن کی گفتگو کا موضوع ہوا کرتا تھا۔ بچّوں کے مستقبل کی فکر اُن کی خود ساختہ مصروفیت تھی۔ کچھ دنوں کی نیازمندی کے بعد میں اُن کا آئیڈیل بن گیا۔ جب کبھی اپنے بیٹوں کو فہمائش کرتے۔ تو یہی کہتے۔

"حکیم صاحب بن جاؤ۔ تو جانیں" وہ اپنی بزرگی اور میری خوردی کے باوجود مجھے "حکیم صاحب" ہی کہتے تھے۔ یہی وہ وضع داری اور کلچر تھی جس کا ماتم آج دِلّی کے گھر گھر میں ہو رہا ہے۔ نواب صاحب کی چشمِ التفات دیکھی تو اُن کی بیگم صاحبہ بھی مجھے اپنے بچّوں کی طرح سمجھنے لگیں۔ اور ممتاز حسن کے بہن بھائی مجھ سے بڑے بھائی کی طرح محبّت کرنے لگے۔ اِس گھر میں اُس وقت سے اِس وقت تک جو آؤ بھگت میری ہوتی ہے۔ اُسے دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ میں اور ممتاز حسن میں کوئی فرق یا تمیز ہے۔

میں جب میرٹھ آگیا تو دِلّی کے کئی کئی چکّر ہونے لگے دِلّی اور میرٹھ کے رستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ غازی آباد ہے۔ مغل شہنشاہوں کے زمانے میں یہ سرزمین شہزادوں کی شکارگاہ تھی۔ اِس میں اب بھی پرانے زمانے کے شریف اور نجیب لوگ آباد ہیں۔ اِنہیں میں سے ایک معزّز گھرانے کے دو چشم و چراغ ضمیر الاسلام اور نذیر الاسلام میرے ساتھ علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ بعد میں نذیر الاسلام بھی میرٹھ کالج میں آ گئے۔ ان کا دِل محبّت کا سمندر تھا اور

اس قدر لبریز کہ جب وہ دوستوں سے ملتے تھے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلتا تھا۔ آج کل خدا کے فضل سے وہ حیدر آباد دکن کے عساکرِ قاہرہ میں لفٹننٹ کرنل کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ جب مَیں دِلّی جاتا۔ تو وہ میرے ساتھ جاتے اور مجھے غازی آباد میں کم سے کم ایک دن کے لئے اپنے دولتکدے پر ضرور ٹھہراتے۔ اِن متواتر اور مسلسل دوروں نے اُن کی مہماں نوازی کو کبھی نہ تھکایا۔ ہر مرتبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مَیں اُن کے گھر میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ اور ہر بار میری تواضع میں وہ سرگرمی دکھائی جاتی جو بڑے بڑے گھرانوں میں کسی نئے مہمان کا استقبال کیا کرتی ہے۔

دِلّی آتے جاتے جب کبھی پرانی محبّت جوش مارتی۔ تو مَیں علی گڑھ چلا جاتا تھا۔ آفتاب منزل کے مکینوں کی کشش ایسی کشش نہ تھی۔ کہ علی گڑھ جانے کا موقعہ ملے، اور مَیں نہ جاؤں۔ علی گڑھ میں میرے ایک پرانے دوست مولانا سُہا بورڈنگ ہاؤس کی اقامت ترک کر کے اب شہر میں رہنے لگے تھے۔ اُن کی عمر تو کچھ ایسی نہ تھی۔ مگر علم و فضل کی بزرگی اُن

کے قدم چومتی تھی۔ اور تقریر و تحریر میں ان کو وہ مہارت حاصل تھی کہ بڑے بڑے کہنہ مشق ادیب ان کے سامنے طفلِ نوآموز نظر آتے تھے۔ وہ بہت پست قامت لاغر اور نحیف البدن ہیں۔ مگر خدا نے تمام جواہرِ کمال اُن کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ اکثر لوگ انہیں دیکھ کر ایک طفلِ صغیر سِن کا دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مگر جب ان کے چہرے کی متانت اور آنکھوں کی فراست پر نظر جا پڑتی ہے۔ اور پھر جب تفکّر و تدبّر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور غور و خوض کی کٹھالی میں نکھرے ہوئے وہ الفاظ سنائی دیتے ہیں جو کبھی رُک رُک کر اور کبھی ایک بلا خبر روانی کے ساتھ اُن کے منہ سے نکلتے ہیں تو دیکھنے اور سننے والے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین کرنے میں متامّل نظر آتے ہیں۔ اہلِ نظر کے نزدیک نظم میں اُن کا مسلک غالب کے مسلک سے ملتا جلتا ہے۔ اور نثر میں ان کا اسلوبِ نگارش ابو الکلام آزاد کا سا ہے۔ اُس زمانے میں ان کے مکان پر دن رات علی گڑھ کالج کے ان طلبہ کا جمگھٹا رہتا تھا جن کو شعر و شاعری سے شوق اور ادب کی مختلف اصناف سے ذوق تھا۔ میں جب کبھی علی گڑھ آتا تو

زیادہ تر اپنا وقت اُنہیں کی صحبت میں گزارتا۔ میرے اور اُن کے تعلقات اس کے بعد اتنے بڑھ گئے کہ جب میں ۱۹۲۱ء میں مستقل طور پر لاہور میں اقامت گزیں ہو گیا تو وہ ایک مدت تک میرے ساتھ رہے۔ کچھ دنوں کے بعد خورشید احمد خاں ولایت چلے گئے۔ اور مولانا سُہا اپنے وطن کو سدھارے۔ وہ محفل جس کی گرمی سے زندگی کی حرارت قائم تھی، اب سُونی ہو گئی۔ اور علی گڑھ میں ایسی کوئی کشش باقی نہ رہی جو ہزار مصروفیتوں کے باوجود علی گڑھ جانے کے لئے وقت نکلنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔

انسان کے دل میں بھی عجیب وسعتیں ہیں۔ علی گڑھ کا رستہ بند ہوا تو دِلّی کی راہ کُھل گئی۔ دِلّی میں تین گھر ایسے تھے۔ جن کو میں اپنا گھر سمجھتا تھا۔ اور جن کے دروازے میرے لئے دن رات کُھلے رہتے تھے۔ مٹیا محل میں ممتاز حسن کا گھر چوڑی والوں میں ظہیر شمسی کا گھر اور پنڈت کے کوچے میں ظہیر زاہدی کا گھر۔ دِلّی میں قیام کرنے کے لئے اِن تین گھروں میں سے کسی ایک گھر کا انتخاب میری شانِ وُرود کی نوعیّت پر منحصر ہوتا تھا۔ جس قسم کے ہنگاموں کی طرف طبیعت مائل

ہوتی۔ میں اُسی قسم کا ماحول منتخب کر لیا کرتا تھا۔

ظہیر زاہدی کے والد منشی نثار احمدؒ بہت دنوں تک پنجاب میں منصفی کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اِس لئے عام و خاص میں منصف صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ فہم اُن کی محبت کی ممکنات کے اِدراک سے قاصر اور قلم اُس مخزنِ احسان و مروّت کے مکارمِ اخلاق کی وسعتیں بیان کرنے سے عاجز ہے۔ راگ رنگ کے شیدائی، اللہ والوں کے نیاز مند، دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ پنشن اور جائیداد کا کرایہ اور وہ سب کچھ جو اُنہیں کسی طرح بھی میسر آ سکتا تھا۔ دوستوں کی خاطر مدارات میں اُڑا دیتے تھے اور پھر خاطر مدارات بھی ایسی نہیں کہ جو اُن کا جی چاہے۔ وہ مہمان کو کھلائیں۔ بلکہ جو کچھ مہمان کھانا چاہے، وہی بہم پہنچایا جاتا تھا۔ مجھے اُن کے گھر کے پکے ہوئے ٹوٹے مسالے کے قورمے اور پراٹھوں سے بڑی رغبت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے بیٹوں کو آواز دیتے "ظہیر، نصیر اپنی امّاں سے کہہ دو۔ آج ٹوٹے مسالے کا قورمہ اور پراٹھے پکیں گے۔" وہ دوستوں کی صحبت کے اِس قدر شائق تھے کہ خود کرایہ خرچ کر کے

حضرت بیدل اور ملک فضل الرحمٰن کو لاہور سے، پروین کو بمبئی سے اور ڈاکٹر سیّد محمدؐ کو الہ آباد سے بلوا لیا کرتے تھے۔ اور اُس وقت تک دِلّی سے واپس نہ جانے دیتے تھے جب تک یہ سب لوگ یکے بعد دیگرے اُن کی آنکھ بچا کر یا کسی نہ کسی ناگزیر ضرورت کا بہانہ کر کے نہ چلے جاتے۔ افسوس! آج نہ تو وہ خود زندہ ہیں۔ نہ ظہیر زاہدی ہی اس دنیا میں موجود ہے۔ ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ میں ان کی محبت اور مروّت کو آج تک نہیں بھولا۔ پنڈت کا کوچہ ہمارے لئے اِن دونو باپ بیٹوں کے دم سے آباد تھا۔ وہ گئے تو اس کوچے میں ہمارا آنا جانا بھی گیا۔ ہر صبح و شام ٹرام میں بیٹھ کر پنڈت کے کوچے کا ٹکٹ لینا اب ایک بھولی ہوئی کہانی ہے۔

انہیں منصف نثار احمدؐ کی وساطت سے مجھے دودمان شریف خانی کے وارثِ اکبر حضرت مسیح الملک حکیم محمدؐ اجمل خاں کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہُوا اور انہیں کی بدولت میری رسائی ان لوگوں تک ہوئی جو دِلّی کی پُرانی عظمت کی یادگار تھے۔ اور تنگدستی اور نامساعدتِ روزگار

کے باوجود اپنی پرانی وضع داری کو نباہے چلے جا رہے تھے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

ذوقِ تماشا نے اِن لوگوں کی محفلوں میں نظارۂ جمال اور سرورِ نغمہ سے وُہ وہ کیف حاصل کئے کہ اب تک یہ پتہ نہیں چلا کہ آیا جوانی سے رنگی ہوئی نگاہ میں اتنا حُسن تھا کہ اُسے ہر چیز خوبصورت نظر آتی تھی یا وہ مناظر ہی اتنے دلفریب تھے کہ انہوں نے اپنا حُسن نظر کو مستعار دے دیا تھا۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے احباب میں خواجہ غلام نصیر الدینؒ ایک با ارادت اور صفا کیش رئیس تھے۔ وہ نواب بُدھن نظامیؒ کے لقب سے مشہور تھے۔ اور چِتلی قبر کے سامنے رہتے تھے۔ اُن کا مکان اب تک نواب بُدھن کا کمرہ کہلاتا ہے۔ اُن سے میرا تعارف خواجہ حسن نظامی نے کرایا۔ اور پھر اُن کی معرفت مجھے نواب شجاع الدین خاں تاباں اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی

کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔

نواب غلام محمد حسن خاں کے ملنے والوں میں نواب فیض احمد پرانی وضع کے ایک کہنہ سال اور شریف و نجیب بزرگ تھے۔ ان سے اور حضرتِ بیخود دہلوی سے میری ملاقات نواب صاحب ہی کے دولتکدے پر ہوئی۔ اِن تمام مراسمِ عقیدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دِلّی میرا دوسرا وطن بن گئی۔ اور مَیں جن صحبتوں کی تلاش میں تھا مجھے میسّر آگئیں۔ کبھی نواب بُدھن نظامی کی مجلس میں تصوّف اور ملفوظاتِ خواجگانِ چشت رحؒ کے معارف سُنتا۔ کبھی حضرتِ مسیح الملک رحؒ کے دولتکدے پہ حضرتِ تاباں، حضرتِ سائل اور حضرتِ بیخود کے کلام سے ذوقِ سخن کی تشنگی بجھاتا۔ کبھی نواب غلام محمد حسن خاں کے دیوان خانے میں نواب فیض احمد خاں، میر باقر علی داستان گو اور حضرتِ بیخود سے اُس اُجڑے دیار کی بربادی کے افسانوں کو چشمِ عبرت کا سُرمہ بناتا۔ کبھی منصف نثار احمدؒ کی بیٹھک میں ابو محمدؒ، مشتاق احمد زاہدی اور حضرت بیدلؔ جیسے بے تکلف دوستوں کی تصنّع سے بری اور ریا سے پاک صحبتوں سے لطف اُٹھاتا اور کبھی سُلطان جی کی درگاہ پر

حاضر ہو کر خواجہ حسن نظامی کے رین بسیرے کی محافلِ سماع میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔

ایک مرتبہ حضرتِ مسیح الملک کے دولتکدے پر حضرتِ تاباں، حضرتِ سائل اور حضرتِ بیخود تشریف رکھتے تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ یہ مشاعرے کی سی ایک مختصر بزم تھی سب نے ایک مصرعِ طرح پر اپنی اپنی غزل پڑھی۔ حضرتِ سائل کا یہ مشہور شعر اُن کی اسی غزل کا مقطع ہے۔

تمنا تھی کہیں پردیس میں کچھ مانگ کھائیں گے
مگر قسمت میں تھے سائل جہاں آباد کے ٹکڑے

حضرتِ تاباں کا اسی زمین میں یہ شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

بُری ہوتی ہے کیفِ بادہ کی لُکنت کہ ہوتے ہیں
زباں سے تا بہ لب آتی ہوئی فریاد کے ٹکڑے

اسی مصرعِ طرح پر میں نے بھی اسی وقت فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

ہزاروں بے جا دلِ ناشاد کو مر مر کے مٹنے کی
اُڑا جا بیٹھ کر دل سے خانماں برباد کے ٹکڑے

سب نے تعریف کی۔ حضرتِ تاباں نے بڑی داد

دی۔ جب تک وہ زندہ رہے ہمیشہ اصرار کرتے رہے کہ تم غزل لکھا کرو۔ اور مجھ سے اصلاح لیا کرو۔ یہ سعادت مجھے نصیب تو ہوئی۔ مگر اُس قدر نہیں جس قدر وہ چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری طبیعت کو محض قافیہ پیمائی اور ردیف آرائی سے کچھ ایسی مناسبت ہی نہ تھی۔

منصف صاحب کے مکان پر بھی کبھی کبھی شعر و سخن کا سلسلہ ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ان کے ہاں کلکتے کے ایک شاعر تشریف فرما تھے، صولت تخلّص کرتے تھے اور ان کا سلسلۂ تلمّذ میر انیس کے خاندان سے جا ملتا تھا۔ ان کی آمد کی تقریب سے منصف صاحب کے مکان پر شاعروں کی مجلس اکثر رہتی تھی۔ ایک دن حضرت صولت نے اپنا ایک مصرع پڑھا جس میں اکثر قافیہ اور ٹانکے ردیف تھی۔ سب سے کہا "اس مصرعے پر شعر کہو۔ میں نے بھی یہ شعر عرض کیا۔ جو انہیں بہت پسند آیا۔

فرقتِ یار میں رو رو کے بہت دن ساحرؔ
ہم نے دامانِ شبِ تار پہ گوہر ٹانکے

اِس پر ایک صاحب نے فرمایا "دن میں شبِ تار کہاں

ہوتی ہے۔" حضرتِ صولت نے کسی قدر خشمگیں انداز سے جواب دیا۔ اب دِلّی والے بھی اُردو بھول گئے؟ لڑکا ٹھیٹھ اُردو زبان لکھ گیا ہے۔

اِسی طرح ایک دن نواب بُدّھن کے دولتکدے پر کچھ باخدا لوگوں کی محفل گرم تھی۔ اور گناہ و ثواب کا ذکر ہو رہا تھا، سوال یہ درپیش تھا کہ آمرزشِ گناہ کے لئے کون سا وظیفہ کار آمد ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا "آنسو" میں نے یہ نکتہ اُسی وقت اِس شعر میں موزوں کر کے پیش کیا۔ سب نے داد دی۔

پروئے آنسوؤں کے چند دانے تارِ مژگاں میں
اِسی تسبیح پہ دن رات استغفار پڑھتا ہوں

ایک دن نواب غلام محمد حسن خاں صاحب کی حویلی میں چند بامذاق لوگ میرے کمرے میں جمع تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں حضرتِ غالب رہا کرتے تھے۔ میر باقر علی داستاں گو نے ایک شعر پڑھا جس کا قافیہ رہزن تھا اور ردیف دست فرمایا "کسی زمانے میں دِلّی والے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔" میں نے کہا "اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔" نواب فیض احمد

نے فرمایا "کہو" میں نے برجستہ یہ شعر کہا" سب نے بہت پسند کیا۔

میرے سینے میں ہے دل یا ایک مارِ آستیں
رہ کے پہلو میں مرا دشمن ہے اور دشمن کا دوست

میر باقر علی نے کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ میرزا غالب کا فیض ہے" اُس زمانے میں طبیعت اِس قدر موزوں تھی۔ کہ جو بات بھی منہ سے نکلتی تھی۔ شعر بن جاتی تھی۔ یا یوں کہیئے کہ طبیعت شعر کی سرزمین میں نئی نئی راہیں نکال رہی تھی۔ مگر ابھی تک مذاق کی شستگی سے محروم تھی۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے سینے کے اندر آگ مشتعل تھی جس سے پتھر جل جل کر کوئلہ بن رہے تھے، مگر ابھی تک الماس نہ بنے تھے۔ میں نے یہ اشعار اِس کتاب کے متن میں ارادتاً شامل نہیں کئے۔ ہیروں کے مینا بازار میں کنکر کیسے سجاتا۔ تاہم اِس قسم کے کچھ اشعار بھی اِن صحبتوں کے سلسلے میں لکھ دیئے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ طبیعت جس راہ سے قصرِ شیریں تک پہنچنا چاہتی تھی وہ کوہِ بے ستون کی سنگلاخ چٹانوں میں سے جاتی تھی۔

اِن اذکار سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ جن بزرگوں کا ذکر اوپر آیا ہے، میں اُن کا ہم پلہ یا ہم عمر تھا۔ میری عمر اس وقت ابھی بیس برس کی بھی نہ ہوتی تھی۔ اور میری شاعری تو ابھی گھٹنوں ہی چلتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ طبیعت ابتدا ہی سے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی طرف مائل تھی نفسیاتی اعتبار سے اِس کا باعث یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنا بچپن اپنی عمر سے بہت زیادہ عمر کے لوگوں کی صحبت میں گزارا تھا اور پرانے لوگوں کی باتیں دل کو کچھ ایسی بھا گئی تھیں۔ کہ اُن کے سامنے اپنے ہم عمر دوستوں کے ہنگامے بازیچۂ اطفال نظر آتے تھے۔ میری شاعری میں یہ جو ایک واعظ اور ناصح کا سا اندازِ تخاطب ہے اس کی وجہ بھی حقیقت میں یہی ہے کہ میں اوائل عمر میں اِس انداز کے سوا کسی دوسرے انداز سے آشنا ہی نہ ہوا۔ اور میری فطرت کی تعمیر اُس آب و گل سے ہوئی۔ جو روحانی پیشواؤں اور فلسفۂ حیات کے معلموں کا خمیر ہوتی ہے۔ اِس فانی دنیا میں اُن چیزوں کی تلاش جنہیں ابدی بقا حاصل ہے اور متاعِ حیات کے عارضی

جاہ و جلال سے عبرت حاصل کرنے کی بصیرت یعنی فنا کے آئینے میں بقا کے نظّارے دیکھنے کی استعداد اور عروج و اقبال کی بلندیوں پہ زوال و انحطاط کی گہرائیوں کو نگاہ میں رکھنے کی صلاحیّت اُن لوگوں کی صُحبت کا اثر ہے جنہوں نے اِس فانی دنیا کی نظر فریبیوں سے بے نیاز ہو کر اُس ذات سے لَو لگا رکھی تھی جو فنا کے اندیشے سے فارغ اور زوال کے خوف سے بے پَروا ہے اور جن کے بوریا کو وہ بلندیاں حاصِل تھیں جو بادشاہوں کے تخت و سریر کو میسّر نہیں آ سکتیں۔ میرے اشعار کے آبگینوں میں یہی چیز سب سے زیادہ جھلکتی ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ مَیں اِس دنیا کی مسرّتوں سے بہرہ مند ہونے کو بُرا سمجھتا ہوں یا حواس کی لذّت آشنائیوں کو جوانی کا حق نہیں جانتا تھا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ سُرورِ مے خمار سے غافل نہ رہے اور تجمّلِ شباب پِیری کی خمیدگی نگاہ میں رکھے۔ تکبّر انسان کو اتنا سرکش نہ کر دے کہ رستہ چلنے والوں پر کیچڑ اُچھالتا پھرے۔ اور انکسار اُسے اِتنا سُبک سر نہ بنا دے کہ ہر کس و ناکس کے دروازے کی خاک سے اپنی جبینِ نیاز کو آلودہ کرتا رہے۔

لوگ شعر کو شاعروں کی بیاضوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اُسے زندگی کی کتاب میں نہیں ڈھونڈتے۔ زندگی کا سب سے بڑا شعر جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ انسان اپنی عمر کے مختلف مدارج پہچانے۔ بچپن اور شباب کی نادانیوں کو اتنا کہنہ سال نہ بنا دے کہ اُس کی پیری بچپن نظر آئے۔ اور شباب کی اُمنگیں اس کی بوالہوسی کی ہنسی اڑائیں۔ ظاہر ہے کہ مذاق کا یہ تناسب اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب انسان اپنے اندر زندگی کے اِن تین مستقل اور ایک دوسرے سے مختلف مدارج کی اپنی اپنی اہمیّت سمجھنے اور ان کا اپنا اپنا حُسن دیکھنے کی استعداد پیدا کرے اور اس راز کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے کہ بچپن جوانی اور بڑھاپے میں انسان کی صورت تو تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر انسان شخصی اور فطری اعتبار سے خود تبدیل نہیں ہوتا۔ گویا انسان اِس بہروپ کی دنیا میں ظاہری لباس تو بدلتا رہے۔ مگر اپنے انفرادی اِمتیازات کو تبدیل نہ ہونے دے۔ رنگ رنگ کے فانوسوں کی تبدیلی سے روشنی کا رنگ بدلا کرے۔ مگر شمع کی اپنی روشنی ہر بیرونی تغیّر سے غیر متاثر رہے۔ میں جانتا

ہوں یہ باتیں سیکھنے سے نہیں آتیں۔ اور دل اور نظر کی وسعت لغت میں وسعت کا لفظ پڑھ کر پیدا نہیں ہو سکتی۔

انسان کی زندگی کی طرح اس دنیا کی ہر شے پر بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا زمانہ آتا ہے۔ بس وہ لوگ جنہوں نے ایسی نظر پیدا کر لی ہے جو ہر چیز کا اندازہ کرنے میں اسی اضافی تناسب سے کام لے سکے، زندگی کا شعر سمجھ گئے ہیں۔ اور یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس دنیا میں جس زندگی کو جنت کہتے ہیں وہ ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہے۔ میں زیادہ تر اپنے فطری تقاضات سے زندگی کو اسی چشمے کی وساطت سے دیکھنے کا عادی رہا ہوں۔ اس لئے ان کہنہ سال بزرگوں کی صحبت میری انگلی پکڑ کر مجھ کو عقل و دانش کے رستے پر چلاتی تو رہی مگر میرے لڑکپن کے لاابالی پن اور میرے شباب کی وارفتگی کے جوش کو نہ دبا سکی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں کی خرد افروز صحبتوں کے ساتھ جوانی کے ناعاقبت اندیش ہنگامے بھی برابر جاری رہے۔ ممتاز حسن۔ ظہیر زاہدی۔ ظہیر شمسی۔ شمس الاسلام حیدر حسن۔ ضیاء الحق اور میں دہلی اور میرٹھ کی گلیوں کو زندگی کی دلفریب

وادیاں سمجھ کر اُن میں برسوں گھومتے رہے۔ کبھی یہ وادیاں سرسبز اور شاداب میدانوں میں جا نکلیں اور کبھی خم در خم اور دشوار گزار گھاٹیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ قدم قدم پر پاؤں پھسلے اور سنبھلے۔ امیدوں سے بے نیاز اور مایوسیوں سے بے پروا ماضی کی یاد کو حال کا سرور بنائے اور حال کے سرور میں مستقبل کے خمار کو بھلائے ہم زندگی کے اس زمانے کو جسے شباب کہتے ہیں یا شباب کو جو زندگی کا دوسرا نام ہے، گزارتے چلے گئے۔ زندگی کے کچھ نشیب و فراز اُس وقت دیکھ لئے اور کچھ بقیۃ العمر کے لئے اُٹھا رکھے۔ میں نے اوپر بزرگوں کی دو تین صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔ مناسب ہے کہ اب دو ایک ایسے ہنگاموں کا بھی ذکر ہو جائے۔ جن پر زندگی کی رونق موقوف تھی۔ انہیں دنوں کی بات ہے ظہیر شمسی کی شادی کی تقریب پر ہم سب دوست ان کے مہمان تھے۔ کھانے کے بعد سب مہمانوں کی تواضع گھنٹہ گھر والے حلوائی کی مٹھائی سے کی گئی۔ مجھے مٹھائی سے بچپن ہی سے رغبت نہ تھی۔ اور سب نے مٹھائی کھانے میں بڑی بے تکلفی سے کام لیا۔ اشفاق کہیں سے ہارمونیم اٹھا لائے۔ سب دوستوں نے اپنی اپنی پسند

کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ اتنے میں ظہیر شمسی بھی آ نکلے۔ ہم سمجھتے تھے۔ وہ دولھا بن کر آئیں گے۔ سر پہ زر بفت کی زرتار چوگوشیہ ہوگی۔ یا سنہری اور روپہری دوپلّی۔ مگر دیکھا تو ان کے سر پہ ایک بڑا سا سولا ہیٹ رکھا تھا۔ طبیعت جو گدگدائی تو میں نے ہارمونیم سے سُر ملا کر یہ اشعار یکے بعد دیگرے گھڑ گھڑ کر گانے شروع کر دیئے۔ ان اشعار کی ویسے تو کوئی قدر و قیمت نہیں۔ مگر میرے نزدیک اِس لئے گوہرِ شہوار ہیں کہ اعلیٰ حضرت تاجدارِ بھوپال کو بہت پسند آئے۔ انہیں ان شعروں میں سے کوئی کوئی شعر اب تک یاد ہے۔

سجتی ہے تیرے سر پہ فرانسیس کی ٹوپی
شرمندہ اسی سے تو ہے برجیس کی ٹوپی
بپتسمے کے دن تیرے لئے روم سے آئی
پطرس کی قبا قادرِ جرجیس کی ٹوپی
دو کوڑی کی ٹوپی کے لئے اتنا تکلّف
لی ہوتی میاں کوئی تو دس بیس کی ٹوپی
جھکتی ہے بصد عجز تیرے ٹوپ کے آگے
اس بزمِ شیاطین کے ہر ابلیس کی ٹوپی

ساحرؔ بھی تیری نذر کو کلکتے سے لایا
چو گوشیہ، کمخواب کے کٹ پیس کی ٹوپی

بہت دیر تک ہم لوگ یہ اشعار قوالی کی طرز پر گاتے اور ہُو حق مچاتے رہے۔ ہاں میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ کہ وہ لوگ جنہوں نے گھنٹے گھر والے حلوائی کی مٹھائی پر خوب ہاتھ صاف کئے تھے۔ رفتہ رفتہ کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگے ہیں۔ آخر کار اُن میں سے دو ایک تو غبی ہو گئے۔ کچھ رونے لگے۔ کچھ بے اختیار ہنسنے لگے اور کچھ اس طرح ہاتھ پاؤں ہلانے لگے۔ جیسے کوئی دریا میں تیرتا ہے یا اندھیرے میں ٹاک ٹوئیے مارتا ہے۔ بعد میں معلوم ہؤا کہ دِلّی میں گھنٹہ گھر والے کی مٹھائی ایک مشہور چیز ہے۔ اور اس میں بھنگ ملائی جاتی ہے۔ یار لوگ اسے کھاتے ہیں اور معجونِ فلک سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ میں میرٹھ میں نواب مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہ کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں کی خدمت میں حاضر تھا۔ نواب صاحب مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے اور اکثر شام کے وقت مجھے اپنے ہاں بلا لیا کرتے تھے۔ میرے

متعلق اُن کا حسنِ ظن غلو کی حد تک جا پہنچا تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔ "تم سے زیادہ خوش مذاق اور صحیح اُردو بولنے اور لکھنے والا پنجابی میری نظر سے نہیں گزرا۔" شام کو وہ اپنے محل قصرِ مصطفےٰ کے وسیع چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ اُن کی مجلس ایسی ہوتی تھی۔ جیسے کسی والئی ریاست کا دربار ہو۔ بڑے خوش پوش تھے۔ آنکھوں میں رعب داب، گفتگو میں تحکمانہ انداز اور میل جول میں بڑا رکھ رکھاؤ۔ اُن کے پاس سبھی قسم کے لوگ آتے تھے اور وہ ہر ایک سے علیٰ قدرِ مراتب بڑی محبّت سے ملتے تھے۔ اُس دن اتفاق سے ایک بزرگ آ نکلے۔ جو اپنے آپ کو بہت بڑا قوم پرست اور مسلمانوں کا بھی خواہ سمجھتے تھے۔ سلسلۂ کلام چلتے چلتے اِس طرف جا نکلا کہ مسلمانوں کی ترقّی اور بہبود کا کوئی سامان اس تہذیب میں نہیں جسے پرانے زمانے کے کٹ مُلّا اسلامی تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں۔ فرمانے لگے "اگر ہم لوگ مسلمانوں کی کشتی بھنور سے نہ نکالتے تو وہ کب کے ڈوب گئے ہوتے۔" نواب صاحب کو مسلمانوں کی پُرانی تہذیب سے بڑی محبّت تھی اور علمائے اسلام سے ایسی عقیدت جو آج امراء میں مفقود ہے۔ سننے

گو تو وہ یہ باتیں سنا گئے مگر صاف نظر آتا تھا کہ اُن کی طبیعت شگفتہ نہیں ہے۔ میری جرأت کی شوخی مجھے بار بار مجبور کرتی تھی کہ میں کچھ کہوں۔ مگر نواب صاحب کو خاموش دیکھ کر دم بخود تھا۔ جو طوفان حفظِ مراتب کے لحاظ سے سینے کے اندر دب گیا تھا۔ تنہائی میں امنڈ پڑا۔ میں قلم دوات لیکر بیٹھ گیا۔ اور اِس واقعے کے بیان میں ایک قطعہ موزوں کر ڈالا۔ دوسرے دن میں اِس قطعے کو لیکر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ مدّت تک یہ کیفیت رہی۔ کہ جب کبھی اُن کے دوست احباب اُن سے ملنے آتے اور میں بھی موجود ہوتا۔ تو وہ مجھ سے یہ قطعہ پڑھنے کو ارشاد فرماتے اور جب میں اُس کے آخری شعر پہ پہنچتا تو کھِل کھِلا کر ہنس پڑتے۔

کل مجھ سے یہ کہنے لگے اِک مردِ مُتشخّص
آداب سے واقف یہ مسلمان نہیں ہیں
کیا دیدہ دلیری ہے سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ
بے دین ہیں اور صاحبِ ایمان نہیں ہیں
ہیں آپ صفا کیش ذرا کیجئے انصاف
اِسلام پہ کیا اپنے یہ بہتان نہیں ہیں

کیا اپنے مکانوں میں بھی قرآں نہیں موجود
اور اس کے لئے ریشمی جزدان نہیں ہیں
وہ دیکھئے کونے میں ہے تسبیح و مصلّے
کیا خانۂ مسلم کے یہ ساماں نہیں ہیں!
یہ سچ ہے کہ قائل نہیں ہم لوگ خدا کے
پر اس کے لئے کیا کوئی برہان نہیں ہیں؟
یہ جنّت و دوزخ، یہ سزا اور جزا ۔ کیا
اسلاف کے افکارِ پریشان نہیں ہیں؟
اس دور میں اُس دین کو کیا کیجئے جس میں
شربِ مئے گلفام کے امکان نہیں ہیں
امدادِ بتاکے لئے روزے کے چندے
انساں پہ کیا مفت کے تاوان نہیں ہیں؟
ہیں آج مسلمان بھی زمانے میں معزّز!
یہ آپ کی تہذیب کے احسان نہیں ہیں!
جن لوگوں نے یہ بگڑی ہوئی بات بنا دی
مردانِ حق اندیش ہیں نادان نہیں ہیں
لاریب ہمیں سے ہے اب اسلام کی رونق

یہ از منۂ بوذر و سلمان نہیں ہیں
کی عرض کہ اے قبلہ قسم آپ کے سر کی
بے جا و غلط آپ کے فرمان نہیں ہیں
پر کیجیئے گر غور تو یہ آپ کے اطوار
اسلام کے اخلاق کے ارکان نہیں ہیں
اسلام کے ہمدرد، مسلمانوں کے مصلح
سب کچھ ہیں مگر آپ مسلمان نہیں ہیں

اُن کے صاحبزادے نواب اسمٰعیل خاں اب بھی مجھ پر اپنے والدِ محترم کی سی شفقت فرماتے ہیں۔ اور جب کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بڑی محبّت سے ملتے ہیں۔ اِسی زمانے میں ظہیر شمسی ریلوے کے اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ ہو کر دِلّی سے چلے گئے۔ شمس الاسلام گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم ہو گئے۔ نواب غلام محمّد حسن خاں کی وفات کے باعث ممتاز حسن خاں اپنی زمینداری اور جائیداد کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ظہیر زاہدی ملازمت کی فکر میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان کے چکر کاٹنے لگے۔ غرض جہاں

تک دلّی کا تعلق تھا ہماری محفلیں سُونی ہوگئیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زندگی کی محفل بے رونق ہوگئی۔ ہُوا تو صرف یہ ہُوا کہ زندگی کے ہنگاموں نے اپنا مرکز تبدیل کر لیا۔ جو بزم آرائیاں پہلے دلّی میں ہُوا کرتی تھیں وہ اب میرٹھ میں ہونے لگیں۔ یارانِ طریقت کی یہاں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ مسعود ہاشمی۔ صابر حسین۔ نذیر الاسلام۔ مقبول حسن۔ طفیل احمد قریشی۔ ذاکر حسین۔ عبدالجبّار خاں اور بندہ حسن تو میرٹھ میں موجود ہی تھے۔ ضیاء الحق، حیدر حسن اور سُہا بھی آ گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ممتاز حسن اور ظہیر زاہدی بھی ہفتوں میرٹھ میں قیام کیا کرتے تھے۔ اِن کے ایک انگریز دوست مسٹر میبر بھی اِن کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ جن سے ہمارے ایک انگریز دوست مائیکل برٹرینڈ چیبر کی بڑی پرچ چلتی تھی۔

جب یہ دوست میرٹھ میں جمع ہو جاتے تو میرے کمرے میں دن رات میلہ سا لگا رہتا۔ ماسٹر محمد یعقوب جو ٹیلر ماسٹر بھی تھے اور ہارمونیم ماسٹر بھی۔ اپنا ہارمونیم لے کر ہر روز شام کو آ جاتے تھے۔ بڑے بامذاق آدمی تھے۔ "کم سے کم" ان کا تکیۂ کلام تھا۔ کم سے کم ایک سُوٹ تو سِلنا ہی چاہیئے۔ کم سے کم ایک

گانا تو آپ بھی گایئں۔ کم سے کم دو چار روز تو اور قیام کیجئے"
غرض ان کی کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی۔ جو "کم سے کم" سے شروع
نہ ہو۔ ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی ہم سب کی انگلیوں میں ایک
کھجلی سی ہونے لگ جاتی تھی۔ جہاں وہ آئے۔ ہم نے میز
یا کرسی یا کتاب جو کچھ بھی ہاتھ لگا اس پر تھاپ دینی شروع
کر دی۔

آغا حیدر حسن دِلّی کی زبان خوب بولتے تھے جیسے وہ کبھی
تو اُردوئے معلّیٰ کہتے تھے، کبھی قلعے کی زبان۔ ممتاز حسن کہا
کرتے تھے یہ بیگماتی زبان ہے۔ اُردو کے محاوروں کے
استعمال پر ان کو اتنی قدرت حاصل تھی، کہ باید و شاید۔ مختلف اشیائ
کے نام وہ اتنی کثرت سے جانتے تھے۔ کہ میں نے میر باقر علی
داستان گو کے بعد صرف اُنہیں کو اسماءُ الاشیا کا ماہر اور علمُ الاشیا
کا عالم پایا۔ علم کی اسی فراوانی اور زباں دانی کی بدولت وہ بعد
میں حیدر آباد کے دارالعلوم میں اُردو زبان کے پروفیسر مقرّر
ہو گئے۔ اور اب تک اِسی عہدے پر مامور ہیں۔ جب یہ دِلّی والے
آپس میں باتیں کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے خوش نوا
بلبلیں چہچہا رہی ہیں۔ ہمارے دونوں انگریز دوستوں کو بھی اردو زبان

میں بڑی دسترس تھی۔ صحیح روزمرّے کے مطابق زبان بولنے کی کوشش ان کے بات بات میں رُک جانے اور پھر کچھ سوچ سوچ کر بات کرنے سے عیاں ہوتی تھی۔ غرض اِس محفل میں کبھی پردوں کے بغیر تھئیٹر ہونے لگتا۔ کبھی شاعروں کے بغیر مشاعرہ کبھی ضلع جگت اور پھبتی سے جی بہلاتے۔ کبھی شعر و سخن کا بازار گرم ہو جاتا۔ اِسی چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک میں راتیں، دن ہو جاتیں۔ اور دن، رات بن جاتے۔ اِن صحبتوں کا ذکر میری ادبی اور مجلسی زندگی سے صرف اتنا تعلق رکھتا ہے کہ دِلّی اور میرٹھ کے شریف اور نجیب گھرانوں کی بولی جو یہ لوگ بولتے تھے میری زبان پر چڑھ گئی اور وہ شُستہ اطوار جو ان لوگوں کی گھٹی میں پڑے تھے، میری طبیعت ثانی بن گئے۔ مَیں جب کوئی شعر کہتا یا کوئی افسانہ لکھتا تو پہلے اِنہیں دوستوں کو سناتا۔ اِن کی تحسین کاوشِ فکر کا سب سے بڑا صِلہ ہوتی تھی اور اُن کی تنقید اشہبِ تخیل کیلئے تازیانے کا کام دیتی تھی۔

اب جو اُس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں، تو سمجھتا ہوں کہ اِن بزرگوں اور دوستوں کی نظر میں مجھے معزز اور محبوب بنانے میں طبیعت کی شوخی نے عِلم و دانش کی فراوانی سے کچھ کم حصّہ نہیں لیا

لیکن سانپ نکل گیا ہے، اب لکیر کیا پیٹا کروں۔ وہ نادان شباب ہی نہ رہا جو تعریف و تحسین کے کھلونوں سے کھیلتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔

میں ۱۹۱۴ء میں میرٹھ کالج میں انگریزی لٹریچر اور تاریخ ہند کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گیا۔ یہ انتخاب کالج کے پرنسپل مسٹر ولیم جلیس اور ہسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر لی کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔ سر سیتا رام جو بعد میں یو۔ پی کی لیجسلیٹو کونسل کے صدر ہوئے، اُس زمانے میں کالج کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ وہ اُس وقت بھی مجھے چشمِ التفات سے دیکھتے تھے اور اب بھی مجھ پر بڑی شفقت فرماتے ہیں۔ اِسی زمانے میں میرے بہنوئی دیوان سید محمد کا ارادہ حیدر آباد دکن جانے کا ہوُا۔ خدا جانے انہیں کیا خیال آیا کہ انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو لکھا۔ میری طبیعت بھی اِس درس و تدریس کی زندگی سے کچھ اُکتا سی گئی تھی۔ اُن کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ کالج سے اتنے دن کی رخصت حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ میرے نزدیک کسی مشکل کو رستے سے دُور کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا انسان اُس مشکل پر غالب آئے یا وہ رستہ ہی چھوڑ دے۔ میں نے کالج کی ملازمت

ترک کر دی اور مستقل طور پر وطن واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ زندگی کا دوسرا دور یہاں ختم ہوتا ہے۔ وہ لوگ جن کے دم قدم سے زندگی کا یہ زمانہ ایک عہدِ عیش و نشاط تھا۔ کب تک اور کہاں تک ساتھ دیتے۔ مگر سعد اللہ اور عابد میرے دو ملازم میرے ساتھ لاہور چلے آئے۔ اُس زمانے کی یہی دو نشانیاں باقی رہ گئیں۔ اور مدت تک اُن محفلوں کی یاد دلاتی رہیں۔ جن کی آرائش میں انہوں نے اہلِ محفل سے کچھ کم حصہ نہیں لیا تھا۔ عابد تو معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ مگر سنتا ہوں سعد اللہ علی گڑھ میں ہے۔ اور بہت ضعیف اور بیمار ہے۔ جی چاہتا ہے۔ اُسے ایک بار دیکھ آؤں۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

دِلّی اور میرٹھ کی صحبتوں کے ذکر میں میرٹھ کالج کا ذکر ذرا دُور جا پڑا ہے۔ مگر اِس کے یہ معنی نہیں کہ یہ میرے دل سے بھی اُتنا ہی دُور ہے۔ علی گڑھ کالج کی خصوصیات علی گڑھ کالج کے ساتھ ہیں۔ لیکن اُس زمانے میں میرٹھ کالج بھی اپنے کوائف کے اعتبار سے ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ میرٹھ کالج کے اساتذہ کا علم و فضل، اُس کے طلبہ کی رواداری اور

علم دوستی اُس کی مجلسِ منتظمہ کے ارکان کی مربیانہ مُروّت اور معارف پروری نے اِس کالج کو پنجاب اور یو۔پی کے اُن طلبہ کا مرکز بنا رکھا تھا جو اکتسابِ علم کے لئے ایک عِلمی ماحول چاہتے تھے اور جنہیں پڑھنے لکھنے کی مصروفیتوں کے لئے ایک گوشۂ عافیت درکار تھا۔ یہ ایک قسم کا گورنمنٹ کالج تھا، مگر اس کا انتظام مفادِ عامّہ کے بہی خواہوں کی ایک کمیٹی کے ہاتھ میں تھا جس میں ہر مذہب وملّت کے مقتدر اور ذی فہم اکابر شامل تھے۔ مسٹر ولیم جلینں اِس زمانے میں میرٹھ کالج کے پرنسپل تھے۔ اور ڈاکٹر لی وائیس پرنسپل۔ مولانا نامی جو بعد میں الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ہوئے۔ اور ان کے بھائی مولانا گرامی فارسی اور عربی پڑھاتے تھے۔ بابو مکرجی جو اپنے وقت میں رائے چند، پریم چند سکالر رہ چکے تھے۔ فلسفے کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر تمّا ریاضیات پڑھاتے تھے۔ اور ایک مدراسی برہمن جن کا نام نہ اس زمانے میں مجھے یاد رہتا تھا اور نہ اب یاد ہے، سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ ان کے عِلم وفضل کی یہ کیفیت تھی کہ اُنہیں تمام ویدوں، اُپنشدوں اور شاستروں کے اشلوک ازبر تھے۔ تاریخِ ہندِ قدیم کے مطالعے میں جو مدد مجھے

اُن سے ملی۔ وہ کسی دوسرے کالج میں یا کسی دوسرے پروفیسر سے نہ مِل سکتی تھی۔ اُس وقت کالج کے تین بورڈنگ ہاؤس تھے۔ ایک ہندو بورڈنگ ہاؤس، ایک مسلم ہوسٹل اور ایک ایسا بورڈنگ ہاؤس جس میں ہندو اور مسلمان مل کر رہتے تھے۔ میں اِسی بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ جب تک میں میرٹھ کالج میں رہا۔ مجھے ایک دن بھی ایسا یاد نہیں جب اِس کالج کے ہندو اور مسلمان طلبہ میں کوئی غلط فہمی یا مذہبی عقائد کی بنا پر کسی طالب عِلم کو کسی پروفیسر سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔

میں نے ہندوستان کے اکثر شہر دیکھے ہیں اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کے رہنے والوں سے میرے مراسم رہے ہیں۔ مگر جو فراخ دلی اور بُردباری میں نے میرٹھ کے رہنے والوں میں دیکھی کسی اور میں نہیں پائی۔ میں اُس زمانے میں بھی میرٹھ کے اِس ما بہ الامتیاز پر غور کیا کرتا تھا اور اِس نتیجے پر پہنچا تھا۔ کہ ہو نہ ہو میرٹھ کی جغرافیائی حیثیت نے اس کے باشندوں میں یہ خواص پیدا کر دیئے ہیں۔ میرٹھ، پنجاب، یو۔ پی اور دِلّی کے صوبوں کا مرکزِ اتصّال ہے۔ اور لازمی ہے کہ یہاں کے لوگ ان تینوں صوبوں کے باشندوں کی آؤ بھگت میں تحمّل اور تواضع سے

کام لیں۔ جو لوگ تہذیب اور تمدّن کے ایک ہی معیار پر اِن تین صوبوں کے مختلف الطبائع اور مختلف السیّر باشندوں کو پرکھتے ہیں۔ وہ اِس قدر بُردبار اور فراخدل نہیں ہو سکتے جس قدر میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ اِسی فقدانِ تناسب کے باعث یو۔ پی کے باشندے پنجابیوں کی سادگی کو بے تمیزی سمجھتے ہیں۔ اور پنجابی یو۔ پی کے رہنے والوں کے تکلّف کو تصنُّع کہتے ہیں۔ کِسی زمانے میں دِلّی ہندوستان کے دارالحکومت ہونے کی حیثیت سے مرجعِ عوام وخواص تھی۔ اور اِس لئے اِس کے رہنے والوں کی نفسیاتی کیفیتیں بھی ایک مرکزی اور اشتراکی سانچے میں ڈھل گئی تھیں۔ دِلّی والوں کو اپنی مسلّمہ فوقیّت کا اِس درجہ اِحساس تھا کہ وہ کِسی دوسرے صوبے کے رہنے والوں کو رشک اور رقابت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن جب انگریزی عہد میں مقامِ حکومت دِلّی سے کلکتے منتقل ہو گیا۔ اور دِلّی میں ایسی کوئی کشِش نہ رہی جو ہندوستان کے مختلف صوبوں کے باشندوں کو اپنی طرف کھینچتی تو یہ نفسیاتی کیفیت بھی رفتہ رفتہ متغیّر ہونے لگی۔ اس کے عِلاوہ اُس اقتصادی بدحالی اور مجلسی تنگ نظری نے جو ایک ناگہاں انقلاب کا لازمی نتیجہ ہوًا

کہتی ہے دِلّی کے رہنے والوں کی عالی ظرفی اور مہماں نوازی کو دِلّی کی فصیل کے اندر محدود کر دیا۔ اور جہان آباد جو اپنی رونق کے زمانے میں ہستناپور، اِندر پرست اور پاٹلی پُتر کی عظمت کی یادگار تھا سکڑا اور بگڑ کر وہ اجڑا دیار بن گیا جس کا رونا میر نے اپنے اِس مشہور شعر میں رویا ہے۔

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

اِس مسکنت اور ناسازگاریٔ روزگار کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دِلّی والے پنجاب اور پورب کے نسبتاً خوشحال اور فارغ البال باشندوں کو رقابت اور رشک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہ رقابت اور رشک کا فتنہ بڑھتے بڑھتے اِس قدر وسیع اور غیر محدود ہو گیا۔ کہ دِلّی والے اُس صحیح اُردو کو جو پنجاب اور پورب کے رہنے والے بولتے تھے اُردو ہی نہ سمجھتے تھے۔ اور اُن کے رہنے سہنے کے ڈھنگ کو گنواروں اور دہقانوں کی ناقابلِ برداشت حد تک نہیں جانتے تھے۔ جب کبھی اُس منافرت کی تاریخ نفسیاتی اعتبار سے لکھی جائے گی جو اس دور میں دِلّی والوں اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے باشندوں کے

درمیان پیدا ہو گئی۔ تو اِس ناگوار صورتِ حالات کا اُس سیاسی انقلاب کے سوا اور کوئی باعث نظر نہیں آئے گا جس نے امیروں کو غریب، شریفوں کو رذیل اور لکھ داتاؤں کو دردر کا بھکاری بنا دیا۔ جب سے مقامِ حکومت پھر کلکتے سے دِلّی منتقل ہُوا ہے۔ دِلّی کے پرانے باشندوں کا زاویۂ نگاہ بھی تبدیل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور دِلّی کی فضا پھر ایک بین الاقوامی کیفیت اختیار کر رہی ہے۔

یہ بات محض بہ سبیل تذکرہ تھی۔ مدعائے بیان یہ ہے کہ میرٹھ کے رہنے والے اُس زمانے میں بھی جغرافیائی تعصّب اور تمدّنی مغائرت کے زہریلے اثرات سے محفوظ اور مامون رہے۔ اور انہوں نے کبھی دِلّی، پنجاب اور یو۔ پی کے رہنے والوں میں کوئی ایسی تمیز روا نہ رکھی جس سے ایک کو دوسرے سے برتر یا کہتر ہونے کا احساس ہوتا۔ میرٹھ میں ہم نہ تو اجنبی ہی نظر آتے تھے اور نہ ہمیں کوئی بیگانہ ہی سمجھتا تھا۔

مَیں میرٹھ کالج کے جس بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا، اس کے سپرنٹنڈنٹ ایک بزرگ تھے جنہیں سب طلبہ

ماسٹر جی کہہ کر پکارتے تھے۔ اُن کا نام شاید کالج کے اسٹاف رجسٹر میں محفوظ ہو تو ہو لیکن جہاں تک ہماری یاد اور ذہن کا تعلّق ہے، ہمیں ماسٹر جی کے سوا ان کا کوئی نام یاد نہیں۔ ماسٹر جی صورت اور سیرت کی خوبیوں کے لحاظ سے واجبِ احترام تھے غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رادھا سوامی مت کے ارادتمند اور ایک مقتدر رُکن تھے۔ میرا اور ان کا کمرہ ساتھ ساتھ تھا۔ میرے مذہبی میلان کے باعث مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے تھے اور مختلف مذہبی عقائد اور رسوم کے متعلق مجھ سے اکثر گفتگو کیا کرتے تھے۔ صبح و شام اپنے وقت کا بیشتر حصّہ گیان دھیان میں صرف کرتے تھے۔ ہر منگل کو محتاجوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ خود سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ مگر ہر مہینے کپڑوں کے دو تین جوڑے اپنے پنتھ کے حاجتمند لوگوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ ان کے مرحوم بھائی کا بیٹا پریم ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی صورت پریم کی مورتی تھی اور دل پریم کا مندر۔ مجھے اُس سے اور اُسے مجھ سے ایسی محبّت تھی جیسے دو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ مذہب کا اختلاف ہندوستانیوں کے باہمی اختلاط میں مانع

ہے۔ اور جب تک ہندو ہندو ہیں اور مسلمان مسلمان، ہندوستان متحدہ قومیّت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مَیں کہتا ہوں یہ غلط ہے۔ اگر ہندو صحیح معنوں میں ہندو ہو جائیں اور مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان۔ تو ان دونو کی باہمی محبّت اور موانست کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ مذہب نیکی کا سرچشمہ ہے۔ اور نیکی کے سرچشمے سے بغض و عناد کا زہر نہیں اُبلتا سیاسی اقتدار کے دیوانے اور ایک دوسرے کی اقتصادی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے خود غرض رہنما تعصّب جیسی بدی کو مذہبی عصبیّت کا لباس پہنا کر نیکی بنانا چاہتے ہیں لیکن لباس کی تبدیلی اصلیّت کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ پریم ہندو تھا، مَیں مسلمان۔ لیکن ہمارا مذہبی اختلاف ہماری محبّت کے رستے میں کبھی حائل نہ ہُوا۔ اگر اس کی زندگی کا رشتہ بے رحم اور سفّاک تقدیر کے ایک ناگہاں تلوّن سے اتنی جلدی نہ کٹ جاتا تو مجھے یقین ہے کہ آج بھی مَیں اور پریم ایک دوسرے کو دیکھ کر اُسی طرح جیتے۔ جس طرح اس زمانے میں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ پریم رام نومی کے دن گنگا اشنان کے لئے گیا۔ اور پھر واپس نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گنگا معصومیّت

اور نیکی کے اِس دیوتا کے درشن کی پیاسی تھی۔ جب اُسے اپنی آغوش میں پایا۔ تو پھر نہ چھوڑا۔ پریم گنگا میں اکیلا نہیں ڈوبا۔ اُس سندرتا کو ساتھ لیکر ڈوبا۔ جس سے میری زندگی کا وہ زمانہ سندر اور من موہن دکھائی دیتا تھا۔

پرنسپل جلیس فوربتھ ایبر کو خود انگریزی پڑھاتے تھے شکسپئیر سے اُن کو خاص رغبت تھی۔ مجھے بھی شکسپئیر کا دلدادہ پایا۔ تو مجھ پر بڑی مہربانی فرمانے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ شیکسپئیر کی کسی مشکل عبارت کا مفہوم مجھ سے دریافت فرماتے تھے اور پھر اس کا موازنہ اپنے مفہوم سے کرتے تھے۔ شیکسپئیر کے ایڈیٹروں میں اس وقت ڈائیٹین، رائٹ، شمٹ اور ویرٹی بہت معتبر سمجھے جاتے تھے۔ مَیں نے جو کچھ سیکھا تھا مسٹر لینگ ہارن سے سیکھا تھا۔ اُن کی جدت آفرینی شیکسپئیر کی عبارت میں نئے نئے مطالب تلاش کر لیتی تھی۔ اُن کا قول تھا۔ کہ شیکسپئیر کی ذہنی کیفیتیں سمجھنے کے لئے اِس امر کی ضرورت ہے کہ شکسپئیر پڑھنے والا خود ایکٹر ہو۔ اور شیکسپئیر کے ہر کیریکٹر کی فطرت کو اپنی فطرت میں منتقل کرنے کا ہنر جانتا ہو۔ یہ بات مَیں نے ایک تو مسٹر لینگ ہارن میں دیکھی،

دوسرے ڈاکٹر ڈنی کلف ہیں اور تیسرے مسٹر جانس ہیں۔ جب مسٹر جانس ہمیں شیکسپیئر پڑھاتے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا ایکٹر کسی نامی اسٹیج پہ اپنا جوہر کمال دکھانے کے لئے بہ یک وقت مختلف کیریکٹروں کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ولیم جانس اُن انگریزوں میں سے تھے جو ملک پر حکومت کرنے کے علاوہ دلوں پر حکومت کرنا بھی جانتے ہیں۔ ہم ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اُن کا ادب بھی کرتے تھے۔ اور ان سے پیار بھی کرتے تھے۔ وہ دفتر میں کسی انتظامی یا انضباطی امر کے متعلق انڈین سول سروس کے ایک کہن سال کمشنر کی طرح گفتگو کرتے تھے۔ جماعت کے کمرے میں ایک بُردبار، مشفقت پسند اور مستقل مزاج استاد کی طرح پڑھاتے تھے۔ کھیل کے میدان میں طلبہ کے ساتھ اُن کے ایک ہم عمر دوست کی طرح کھیلتے تھے۔ اور گھر پہ اُن سے اپنے دلپسند رفیقوں کی طرح ملتے تھے۔ میری اپنی قوتِ حافظہ بھی خدا کے فضل سے بہت اچھی ہے۔ اور اُس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ "پچھلے پچاس برس" کے عنوان کے تحت یہ جو کچھ بھی میں لکھ رہا ہوں، صرف اپنی یاد سے لکھ رہا ہوں۔ میرے

پاس پرانے زمانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے کوئی یادداشت نہیں۔ مگر مسٹر جیکبس اور لارڈ بشپ ڈرینٹ کے حافظے کی قوت بلاشبہ محیر العقل اور فوق العادت تھی۔ بشپ ڈرینٹ نے مجھے ۱۹۱۴ء میں آگرہ کالج میں دیکھا تھا۔ جہاں میں تاریخ ہند قدیم کے سپیشل لیکچرز کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ اُس وقت وہ سینٹ جانس کالج آگرہ کے پرنسپل تھے۔ اِس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۷ء میں جب وہ لاہور کے لارڈ بشپ تھے، مجھے دیکھا۔ معاً پہچان گئے۔ اور میرا نام لیکر مجھ سے پچھلے پچیس برس کے حالات دریافت کرنے لگے۔ مسٹر جیکبس بھی اپنے کالج کے ہر طالب علم کا نام جانتے تھے۔ اور اس کے متعلق وہ سب کچھ بھی جانتے تھے۔ جو ایک استاد کو اپنے شاگرد کے متعلق جاننا چاہیئے۔

ڈاکٹر لی اپنی فطرت اور عادت کے لحاظ سے مسٹر جیکبس سے بالکل متضاد تھے۔ ان کو اپنے کام سے کام تھا۔ نہ کسی کی شکل سے واسطہ نہ کسی کے نام سے غرض۔ حقیقی معنوں میں طالب علم تھے اور سچے عیسائی۔ جب کبھی ہم تاریخ کے کسی واقعے کے متعلق ان سے کچھ دریافت کرتے۔ تو کہتے

"کتاب دیکھ کر بتاؤں گا" اور جب کبھی اپنی روزمرہ زندگی کی کسی مشکل کا حل دریافت کرتے۔ تو فرماتے "پادری سے پوچھ کر بتاؤں گا"۔

مولانا نامی دیکھنے میں بڑے بھاری بھر کم آدمی تھے۔ گفتگو کا کام زبان کی بجائے زیادہ تر ہونٹوں کی مسکراہٹ اور پیشانی کی شکن سے لیتے تھے۔ علم کا صحیح استعمال جانتے تھے اور اس کے سکھانے میں بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ اسی وجہ سے سال بھر میں عربی اور فارسی کا وہ ضخیم کورس جو الہ آباد یونیورسٹی نے بی۔ اے کے امتحان کے لئے مقرر کر رکھا تھا، پڑھا دیتے تھے۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ کے فرائض انجام دینے میں بڑی بالغ نظری اور سیرت شناسی سے کام لیتے تھے۔ بہت آہستہ خرام تھے جب زمین پہ چلتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ کھڑے ہیں اور زمین چل رہی ہے۔ جب کوئی طالب علم بورڈنگ ہاؤس کے پکے ہوئے کھانے کی شکایت کرتا تو اُسے اپنے گھر کا پکا ہؤا کھانا کھلا دیتے تھے۔ مگر جس کسی نے بھی ان کے گھر کا کھانا کھایا یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ دونوں میں سے کون سا کھانا

زیادہ بدمزا ہے۔ مولانا نامی کے بھائی مولانا گرامی اتنے ہی زیادہ بسیار گو تھے۔ جتنے مولانا نامی کم گو۔ بہت لاغر اور نحیف تھے۔ وضع قطع سے پرانے زمانے کے مدّرس معلوم ہوتے تھے۔ کورس کی کتابیں پڑھانے کی جگہ زیادہ تر اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ جو طالبِ علم ان کے کلام کی داد دیتا تھا۔ لائق متصوّر ہوتا تھا۔ اور جو چپ رہتا تھا، نالائق۔ مَیں نے اُن کی جماعت میں لیاقت کے بڑے بڑے میدان مارے۔

بابو مکرجی بڑے بے نظیر انسان تھے۔ وجیہ، تنومند اور رعب دار۔ ان کا رنگ عام بنگالیوں کی طرح سانولا تھا۔ اور مونچھیں سفید۔ آنکھوں میں شرافت اور حلاوت تھی۔ زبان میں نرمی اور شیرینی۔ اُن کی زندگی کی تین مصروفیتیں تھیں۔ پڑھنا پڑھانا اور ناریل پینا۔ مَیں کالج میں اُن کا شاگرد نہ تھا۔ مگر انہوں نے میری طبیعت میں ایک فلسفیانہ میلان پایا۔ تو مجھے ایپک ٹیٹس، ڈائیوجنیز اور اپی کیورس کا فلسفہ اپنے گھر پر پڑھانے لگے۔ مَیں نے زمانۂ قدیم کے صرف اِن تین فلسفیوں کے نام گنوائے ہیں۔ ورنہ اِن کی تعلیمات کی وضاحت کرتے کرتے بابو مکرجی فلسفۂ قدیم و جدید کی دنیا میں ایسی مسافتیں

طے کر جاتے تھے۔ کہ کوئی اُن کی گرد کو نہ پہنچ سکتا تھا۔ گوتم بدھ، مہاویر جینا تری پٹز اور سانکھیہ کے محض فلسفیانہ نظریات سے لے کر پتنجلی اور منو کے سماجی نظریات اور چانکیہ کی راج نیتی تک کے مسائل وہ اِس روانی سے بیان کرتے چلے جاتے تھے جیسے کوئی کہانی سنانے والا کہانی سنا رہا ہو۔ مَیں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن ایک بات جو اُن سے سیکھی، ایسی ہے۔ جس سے کشاکشِ حیات کی صعوبتیں راحتیں بن گئیں اور ہمیشہ کے لئے ایک ایسا مسئلہ حل ہو گیا جس نے ایک عالم کو تسکینِ قلب اور اطمینانِ نظر سے محروم کر رکھا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ ہم نے میرٹھ کالج میں ایک ڈراما اسٹیج کیا۔ میں ڈرامیٹک سوسائٹی کا سیکرٹری تھا اور بابو مکرجی پریذیڈنٹ۔ اِس لئے تمام انتظامی امور کا انصرام ان کے اور میرے ہاتھ تھا۔ کوئی چار سو کرسیاں میرٹھ چھاؤنی کے نندلال کباڑی سے کرائے پر منگائیں۔ ڈراما بہت کامیاب رہا۔ پہلے دن اسے کالج کے طلبہ نے دیکھا۔ دوسرے دن میرٹھ کے امرا اور شرفا نے تیسرے دن شہر والوں کے اصرار پر عوام الناس نے۔ ٹکٹ کی شرح برائے نام تھی۔ اور ہمارے وسائلِ آمدنی محدود۔

چوتھے روز صبح ہی صبح مجھے کرسیوں کے واپس کرنے کی فکر ہوئی تاکہ ایک دن کا کرایہ اور نہ بڑھ جائے۔ میں بابوجی کے پاس گیا۔ فرمانے لگے "ایسی تشویش کیا ہے۔ کرسیاں واپس ہو جائیں گی"۔ میں نے عرض کی "اگر دیر ہوئی۔ تو ایک دن کا کرایہ اور پڑ جائے گا"۔ کہنے لگے "کیوں"۔ میں نے کہا۔ "کرائے کی یہی شرط ہے"۔ جواب دیا "کچھ پروا نہیں۔ ایک دن کا کرایہ اور سہی۔ تم تھک گئے ہو۔ تین راتوں سے جاگ رہے ہو۔ جاؤ آرام کرو۔ نندلال سے کہلا بھیجو۔ اپنی کرسیاں منگا لے اور چار دن کا کرایہ دفتر سے وصول کر لے"۔ میں نے کہا۔ "مناسب یہی ہے۔ کہ ہم کرایہ اور کرسیاں خود بھجوا دیں"۔ حیرت سے فرمانے لگے "یہ کیوں"۔ میرے منہ سے نکل گیا "نندلال بہت بڑا آدمی ہے"۔ یہ سنتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کسی پرسکون سمندر میں دفعتہً طوفان آگیا ہے۔ "نندلال بہت بڑا آدمی ہے؟ ایک کباڑیا بہت بڑا آدمی ہے؟ کرسیاں کرائے پر دیکر پیسہ پیسہ جمع کرنے والا دکاندار بڑا آدمی ہے؟ میں نے جو کچھ تمہیں پڑھایا ہے۔ اس کا یہ حشر ہوا۔ ڈایوجینز، بدھ اور مہاویر کے فلسفے سے تم

نے بھی کچھ سیکھا۔ دولت بھی کسی انسان کو بڑا آدمی بنا سکتی ہے دنیا کا ساز و سامان، جاہ و حشم اور مال و منال بھی تمہاری نظر میں احترام کے لائق ہو گیا۔ جاؤ اپنی کتابیں پھاڑ ڈالو۔"

بابو جی کے کمرے کی ساری آرائش دو چیزوں تک محدود تھی۔ ایک لکڑی کا تخت جس پر ایک پھٹی سی سینتل پاٹی بچھی رہتی تھی۔ اور ایک لمبے بازوؤں والی آرام کرسی جس پر وہ خود بیٹھتے تھے۔ اور جو اُن کے قول کے مطابق ان کے والدِ مرحوم کی جوانی کے تعیّش اور اسراف کی یادگار تھی۔ اِسی پر بیٹھ کر وہ ناریل پیا کرتے تھے، اِسی پر بیٹھ کر وہ پڑھتے تھے۔ اور جب تھک جاتے تھے۔ تو اِسی کے بازوؤں پر پاؤں پھیلا کر سو جاتے تھے۔

جب بابو جی کے منہ سے تہدید کے یہ کلمات نکل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی غدّار درباری کو قہر و عتاب کا ہدف بنا رہا ہے۔ یا کوئی دیوتا اپنے کسی بداعتقاد پجاری پر خشم و غضب برسا رہا ہے۔ میں اُس وقت یہ تمیز نہ کر سکا۔ کہ میں کانپ رہا ہوں یا لکڑی کا وہ تخت لرز رہا ہے۔ جس پر میں بیٹھا تھا۔ میری

زبان بند تھی۔ مگر قلب میں ایک ہیجان برپا تھا۔ آنکھیں بابو جی کے رعب سے زمین میں گڑ گئیں۔ اور سر اُس عزت و عظمت کے پیکر کے سامنے جھک گیا۔ شاید میری اس حالت پر انہیں رحم آگیا۔ یا وہ عارضی کیفیت جو اُن کی فطرت کے عناصر کی برہمی سے پیدا ہو گئی تھی، جاتی رہی۔ یا فلسفی مکرجی پروفیسر مکرجی پر غالب آگیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح طوفان آہستہ آہستہ ختم جاتا ہے۔ یا سیلاب رفتہ رفتہ ساحل سے پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔ بابو جی کی آواز مدھم پڑتی چلی گئی۔

"دولت مندوں کی دولت، عہدے داروں کے عہدے، امیروں کے ساز و سامان اُنہیں کے لئے ہیں۔ اُن سے تمہیں اور مجھے کیا واسطہ۔ اُن کی آسائش سے ہمیں کون سا آرام ملتا ہے۔ اُن کی بڑائی سے ہمارا کیا بنتا، بگڑتا ہے۔ پھر ہم ان کے ساز و سامان کی عزت کیوں کریں۔ اُن کی شان و شوکت کا رعب کیوں مانیں۔ یاد رکھو۔ دنیا میں صرف تین چیزیں عزت کے قابل ہیں۔ وہ فقیر جو دنیا کے لالچ پر لات مار کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گیا ہو۔ وہ عالم جو اپنے علم کے چشمے سے علم کے پیاسوں کو سیراب کرے۔ اور وہ انسان

جس کی صورت کا حُسن یا سیرت کا کمال آنکھوں کو مخمور اور دل کو مسرُور کر دے "!!

وہ دن اور یہ دن میری آنکھیں کبھی انسان کے جاہ و جلال سے مرعوب نہیں ہوئیں۔ مَیں نے دولت مندوں کی عزّت صرف اِس لئے کبھی نہیں کی۔ کہ ان کے پاس دولت ہے مَیں نے کسی بڑے آدمی کو صرف اِس لئے بڑا آدمی نہیں سمجھا کہ دنیا اُسے بڑا آدمی کہتی ہے۔ مَیں نے کبھی اہلِ دِول کے دروازوں پہ ناصیہ فرسائی نہیں کی۔ مَیں اپنی حاجت لیکر کبھی کسی متکبّر انسان کی چوکھٹ پر نہیں گیا۔ ہاں خاک نشین فقیروں کی خاکِ پا کو آنکھوں کا سُرمہ ضرور بنایا ہے۔ علم و فضل کے سرچشموں سے تشنگیٔ ذوق ضرور بجھائی ہے۔ اور حسن و کمال کی بارگاہِ ناز پہ سرِ نیاز ضرور خم کیا ہے۔

غلامِ ہمّت آنم کہ زیرِ چرخ کبود
زہر چہ رنگِ تعلق پذیرد، آزاد است

دنیا کے جاہ و حشم کی چکا چوند سے طبیعت پہلے ہی سے بیزار تھی۔ فقیری کی شان وِرثے میں پائی تھی۔ تصوّف کی تعلیم نے آنکھوں میں فنا کا نقشہ جما رکھا تھا۔ اور باخدا

لوگوں کی صحبت نے دل کو اُن نظاروں سے گرما رکھا تھا۔
جنہیں دنیا والوں کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور اگر دیکھ لے۔
تو اُن کی قدر و قیمت نہیں پہچان سکتی۔ اُس مردِ حق کی تہدید
نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دل اُن جلووں کی دید
سے یکسر بیزار ہو گیا جن کی اُمید کا محل بیس برس کی محنت
اور عرق ریزی سے تیار ہُوا تھا۔ حصولِ عظمت و اقتدار کی
وہ توقعات جو صیقلِ کمال سے چمک گئی تھیں۔ اُن پر زنگ
آنے لگا۔ زندگی کا سارا دستور العمل بدل گیا۔ ماضی نے مستقبل
کا جو خواب دیکھ رکھا تھا، پریشاں ہو گیا۔ جن آیندہ آسائشوں
کے یقین پر موجودہ کُلفتیں کُلفتیں ہی نظر نہ آتی تھیں۔ اپنی دلکشی
کھو بیٹھیں۔ اور دن رات اِسی بات کی فکر رہنے لگی۔ کہ
اگر دنیا کا یہ جاہ و جلال اِس قدر بے حقیقت ہے۔ اور
زندگی کی شادمانیاں اتنی عارضی ہیں۔ تو پھر اُن کے حصُول
کے لئے ایسی کڑی منزلیں طے کرنے سے فائدہ؟ اور
اگر ہر خوشی کا انجام غم، ہر کمال کا انجام زوال اور ہر تعمیر کا
انجام خرابی ہے۔ تو دنیا کے اِس فانی سُکھ کے لئے اتنا
دُکھ اُٹھانے سے حاصِل؟ انسان اِتنا کیوں بڑھے کہ

اس کا گھٹنا دنیا کو محسوس ہو۔ اتنی بلندیوں پہ کیوں پہنچے کہ جب وہ گرے۔ تو لوگ اُسے دیکھنے آئیں۔ ایسا سازوسامان کیوں رکھے۔ کہ جب وہ سازوسامان نہ رہے۔ تو زندگی وبال ہو جائے۔ بابو نگر جی نے آنکھوں سے وہ پردہ اُٹھا دیا جس نے حقیقت کو چھپا رکھا تھا۔ اور اب جب حقیقت کا آفتاب نکل آیا۔ تو باطل پرستیوں کے چھوٹے چھوٹے ستارے ماند پڑ گئے۔ دل نے کہا۔ کوئی ایسا کام کر جا۔ جو دنیا کے کام آئے اور جسے دنیا یاد رکھے۔ دل کی بات سُنی تو دماغ نے زندگی کی کینوس پر نقشے بنانے شروع کر دیئے۔ مصر کی آئیسیز کے کاہن۔ ہیکلِ سلیمانی کے راہب۔ خداوندِ بعل کے پُجاری۔ شِو کے جٹا دھاری۔ بدھ کے بھکشُک۔ مہاویر کے تیاگی۔ فقیر۔ سادھو۔ جوگی۔ بیراگی سب نے عالمِ خیال میں اپنا اپنا جال بچھایا۔ مگر طائرِ نفس کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ آخر دل نے کہا۔ کنول کی طرح زندگی بسر کر۔ پانی میں رہ کر پانی میں نہ ڈوب۔

آشنایانِ رہِ عشق دریں بحرِ عمیق
غرقہ گشتند و نگشتند بآب آلودہ

اِس تمام دماغی کشمکش کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ مَیں نے باطنیہ انداز کا ایک حلقہ قائم کیا۔ اپنے آپ کو ملنگ اور اِس حلقے کو دربارِ ملنگ کہنا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے یہ نیا نظام فرقۂ ملنگیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے پوتے احمد حسن جو کالج میں مردِ سپاہی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ اِس فرقے کے بڑے سرگرم کارکن تھے۔ ملنگیہ نظام کے تین بڑے بڑے اصول تھے۔ اوّل دنیا کے ہر مصنوعی ساز و سامان سے پرہیز اور فطرت کی نعمتوں پر اکتفا۔ دوم بقا سے اجتناب اور فنا کا اشتیاق۔ سوم احسانمندی کے اظہار اور صلے کی امید سے قطع نظر خلقِ خدا کی خدمت۔ اِس فرقے کے پیرو زمین پر سوتے تھے۔ پتوں پر کھانا کھاتے تھے۔ اوک سے پانی پیتے تھے۔ بہت سادہ اور بہت کم کپڑے پہنتے تھے۔ نہ کسی کی طرف دیکھتے تھے۔ نہ ضرورت کے بغیر کسی سے بات کرتے تھے۔ میرے کمرے کا فرش سیاہ تارکول کے روغن سے چمکتا تھا۔ اور اس کی دیواروں اور چھت کے سیاہ ڈسٹمپر سے ہیبت برستی تھی۔ کمرے کی مینٹل پیس پر ایک

کاسۂ سر رکھا تھا۔ جو بڑی مشکل سے حاصل کیا گیا تھا۔ میں دن رات کا بیشتر حصہ اسی کمرے میں بسر کرتا تھا۔ فرش پر آلتی پالتی مارے اُس کاسۂ سر کی طرف دھیان لگائے بیٹھا رہتا۔ کبھی اس کی بے گوشت ہڈیوں پر کلیوپیٹرا اور لوکریشیا بورجیا کا غارت گر حسن سجاتا۔ کبھی اس کو ہینی بال اور جولیس سیزر کے رعب وجلال سے آراستہ کرتا۔ کبھی اس کاسۂ سر میں مجھے وشوامتر اور ویاس کی شکل نظر آتی۔ کبھی افلاطون اور ارسطو کی اور کبھی ہلاگو اور نیرو اہنو باربس کی۔ غرض حسن، کمال فراست، شجاعت، ہیبت اور شقاوت کے اُن تمام مظہروں کی تصویریں اس مشتِ استخواں کے پردے پر دن رات اِس طرح آتی رہتیں جس طرح بائیسکوپ کی تصویریں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ میں خواجہ حسن نظامی کے بتائے ہوئے شغلِ آفتابی کا ایک کہنہ مشق عامل تھا۔ اِس عمل کی سب سے پہلی مشق یہ ہوا کرتی تھی۔ کہ اس کا عامل طلوع کے وقت سے لیکر نصفُ النہار تک آنکھ جھپکے بغیر سورج کی طرف دیکھتا رہے۔ اور اس کی شعاعوں کو اپنی آنکھوں کے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے۔ یہ عادت اِس نئے عمل

میں میرے بڑے کام آئی۔ میں گھنٹوں آنکھ جھپکے بغیر اِس کاسۂ سر کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ اور فنا کے مہیب مگر نہایت دلکش مناظر اپنی آنکھوں کے اندر جذب کر سکتا تھا۔ اِس مشق کا ایک عجیب ردِّ عمل ہوا۔ جب میں کسی زندہ انسان کو دیکھتا۔ تو اس کے چہرے پر سے گوشت اور پوست کے پردے اُٹھ جاتے اور مجھے ہڈیوں کے ایک کرخت ڈھانچ کے سوا اس کے چہرے کے کوئی نقش و نگار نظر نہ آتے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ہر انسان کے جسم پر وہی کھوپڑی دھری ہے جو میرے کمرے کے مینٹل پیس پر رکھی تھی۔ جس تصویر کا خاکہ بابو مکرجی نے لفظوں سے کھینچا تھا میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ انسان کا حسن و جمال اور اس کا جاہ و جلال چند سوکھی ہوئی سخت اور کرخت ہڈیوں کے فرسودہ اور بیکار ڈھانچ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

میں میرٹھ میں رہتا۔ تو ممکن تھا کہ میرے پیروؤں کا حلقہ بہت وسیع ہو جاتا۔ اور فرقۂ ملنگیہ بھی ہندوستان کے کئی خود رَو اور باطل پرست فرقوں کی طرح خدا کے قائم کئے ہوئے اعتدال کے سچّے نظام میں اختلال کا باعث ہوتا۔

اور مذہب کی وہ عظیم الشان برکت جو انسان کو خدائے واحد کی پرستش کے سوا اور ہر چیز کی پرستش سے روکتی ہے اُسی طرح چھین لیتا ہے جس طرح اِس نعمت کو انسان سے ان فرقوں نے چھین لیا ہے جو اُسے خدا کو چھوڑ کر انسان کے آگے جھکنا سکھاتے ہیں۔ میں میرٹھ سے باہر گیا گیا۔ اُس حلقۂ مسحور سے نکل گیا۔ جو میرے وہم باطل نے میری عقل کے اردگرد ڈال رکھا تھا۔ اور جسے سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد پیرووں کی عقیدت اور ارادت روز بروز اور زیادہ وسیع اور مضبوط بنا رہی تھی۔ میرے جاتے ہی وہ خانۂ باطل گر گیا۔ مگر میرے پیرو بہت مدت تک میری راہ دیکھتے رہے۔

بس کہ در خوفِ رسالوس زدم لافِ صلاح
شرمسارِ رُخِ ساقی و مئے رنگینم

حیدرآباد دکن پاکپٹن شریف اور لاہور

میں اِس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کہ میں ۱۹۱۴ء میں میرٹھ کالج میں انگریزی لٹریچر اور تاریخِ ہند کا اسسٹنٹ پروفیسر

مقرر ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ کالج کمیٹی کے اراکین اور اسٹاف کے تمام پروفیسر بالعموم اور پرنسپل جیبس بالخصوص مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ میں تھرڈ ایر کے امتحان میں کالج میں اول رہ کر ہیرنگٹن سکالرشپ کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ میں یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ دیوان صاحب کی دعوت پر میں اُن کے ساتھ حیدر آباد چلنے کو تیار ہو گیا اور میں نے کالج کی ملازمت ترک کر دی۔ یہ بات ۱۹۱۴ء کی ہے۔ یہ سال تاریخِ عالم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اِسی سال یورپ میں اُس جنگ کا آغاز ہوا جو جنگِ عظیم کے نام سے دنیا کو آج تک یاد ہے۔ اور جب تک انسان کو امن و عافیت سے محبت اور فتنہ و فساد سے نفرت ہے۔ اِس جنگ کی یاد ذہنِ انسانی سے محو نہ ہونے پائے گی۔ حقیقت میں یہ جنگ ان تمام رُجحانات کا ردِ عمل تھی۔ جو مغربی سیاست اور فلسفۂ حیات کے ایک نئے نظریئے نے تمام سنٹرل یورپ کے اربابِ فکر و عمل کی طبیعتِ ثانی بنا دیئے تھے۔ پرنس بسمارک نے المانوی اقوام کے تفوّق کو مدِ نظر رکھ کر جس سیاست کی بنیاد ڈالی تھی، اُسے نیٹشا کے فلسفے نے

ایک مذہبی عقیدہ بنا دیا اور رفتہ رفتہ اِن اقوام کی نفسیاتی کیفیت میں کچھ ایسا تغیر رونما ہو گیا کہ بسمارک کی سیاست کی چالیں، اِس مذہب کے ارکان بن گئیں۔ یہ وہی ارکان تھے جنھیں نیٹشا نے اپنی فلسفیانہ منطق سے انسانِ برتر کے عناصرِ فطرت قرار دے دیا۔ اِس مذہب اور فلسفے کی رُو سے انسانِ برتر تمام نوعِ انسانی پر حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اور انسانِ برتر کا اطلاق صرف المانوی اقوام کے افراد ہی پر ہو سکتا ہے۔ اِس نظریئے کا منتہا اِس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ المانوی اقوام کو ایک ایسے آئیڈیل کے نشے سے سرشار کر دیا جائے جس کے کیف میں اِن اقوام کے افراد وہ سب کچھ کر گذریں جو اِس تفوّق کے حصول کے لئے لازمی تھا۔ یورپ کی سیاسی طاقت اور اقتصادی اقتدار کا وہ توازن جو ڈزرائیلی اور گلیڈسٹن کی حکمتوں اور مصلحتوں نے ایک مدت تک قائم کر رکھا تھا۔ جرمنی کے ہمسایہ ممالک کی غفلت اور سہل انگاری سے برقرار نہ رہ سکا۔ برطانیہ کے مشہور مدبّر اور وزیرِ اعظم ڈزرائیلی کی سیاست کی ہیبت پرنس بسمارک کے دل پہ اتنی چھائی ہوئی تھی کہ وہ سارے یورپ میں اگر کسی کو قابلِ اعتنا سمجھتا تھا

تو اُسی کو سمجھتا تھا۔ اس کا یہ مشہور فقرہ۔

"ڈزرائیلی! ڈیٹ از دی مین"

یورپ کی سیاسی تاریخ کی ایک ردِ دشن اور اہم تجربہ ہے قیصر ولیم کچھ تو اپنی طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ اپنے ماحول کے اثر سے برطانیہ اور روس کی طاقتوں کو اپنی طاقت کا حریف سمجھنے لگا تھا۔ یہ احساس رقابت کچھ اِس درجہ بڑھ گیا کہ نفرت کی حد تک جا پہنچا۔ اگر یہ جذبہ ایک قلبی احساس ہی تک محدود رہتا اور اگر قیصر کے افکار اُس کے نہاں خانۂ ذہن ہی میں مقید رہتے تو دنیا کو اُس نقصانِ جان و مال کا سامنا نہ کرنا پڑتا جس کی تلافی صدیوں تک ناممکن ہے۔ مگر یورپ کی بدقسمتی سے قیصر ولیم کو ایسے مشیر مل گئے جو قطع نظر اِس سے کہ اِن کا تعلق جرمنی کے عسکری اور نظامی اداروں سے تھا یا نہیں تھا۔ المانوی اقتدار کو ہر قیمت پر خریدنا چاہتے تھے اور اِس اقتدار کے حصول کے بعد اس قیمت کو بحساب اضعف المضاعف اپنی محکوم قوموں سے وصول کرنا جائز سمجھتے تھے۔ بیتھ مین ہالوگ، ہنڈنبرگ، ذیپلن، میکنسن، لیوڈنڈارف، سٹراسبرگ، ہوسٹکے، کریپ، بیولو، ٹرپٹس اور

اِن سب سے بڑھ کر خود قیصر ولیم اور اس کا ولی عہد مدّت تک ہوہنیز ہولرن خاندان کی عظمت کے خواب دیکھتے رہے اور اس محشر کو اپنے سینے میں پالتے رہے جس نے آخرکار ۱۹۱۴ء میں یورپ میں قیامت برپا کر دی۔ آسٹریا کے شہزادے کا قتل جرمنی کے اِن خداوندانِ حرب کی غارت گری کے لئے ایک بہانہ بن گیا اور وہ سیلابِ آتشین جو چالیس برس تک جرمنی کی حدود کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اِن حدود کو توڑ کر وسطی یورپ کی شش جہت میں بہہ نکلا۔ پیرس کا عہد نامہ صرف کاغذ کا ایک پُرزہ بن گیا۔ بلجیم اور فرانس کی کمزوری ان کا سب سے بڑا جرم قرار دی گئی۔ رحم، انصاف اور قانون ایسے بے معنی الفاظ سمجھے گئے جو شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتے۔ جرمنی کی دولت، جرمنی کی محنت، جرمنی کے بچوں کی جان، غرض جرمنی کا سب کچھ اِسی ایک بازی پر لگا دیا گیا اور جرمنی کے قیصر نے خون آشامی کی وہ ہلاکت آفرین وراثت جو اس نے فریڈرک اعظم سے ورثے میں پائی تھی۔ قوم کے سپرد کر دی۔ اس آتش و خون کی وراثت نے المانوی اقوام کو اُسی طرح اندھا بنا دیا جس طرح ہر ایسی دولت جو محض ورثے میں آتی ہے اور کمائی نہیں

جاتی اُن لوگوں کو اندھا بنا دیتی ہے جو اُسے بے محنت مشقت پا لیتے ہیں۔ اگر برطانوی شرافت اور غیرت، شجاعت و فراست کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس وقت یورپ کی حفاظت اور المانوی اثر کی مدافعت کے لئے سینہ سپر نہ ہو جاتی۔ اور جرمنی کے خداوندانِ حرب کی بساطِ خونیں کو اُلٹنے کے لئے لائیڈ جارج ونسٹن چرچل، لارڈ کچنر، لارڈ رابرٹس، مسٹر بالفور، ارل گرے، مارکوئیس کرزن اور فیلڈ مارشل ہیگ جیسے برطانوی سیاستدان اور مردانِ کارزار میدان میں نہ اتر آتے۔ تو یورپ کی پچھلے پچیس برس کی تاریخ کسی اور زبان اور کسی دوسرے الفاظ میں لکھی جاتی۔ اس تلمیح سے یورپ کی اس جنگِ عظیم کی تفصیلات کا بیان مقصود نہیں۔ مقصدِ بیان صرف یہ ہے کہ اُس وقت ان لوگوں نے جو اعمال کو افکار کا نتیجہ سمجھتے ہیں، دیکھ لیا کہ ایک غلط اور گمراہ کن فلسفے نے اس آگ کی طرح جو پہلے اپنی اردگرد کی چیزوں کو جلاتی ہے اور پھر خود جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اوروں کو جلا کر آخرِ کار اُن اقوام کو بھی خاکِ سیاہ بنا دیا جن کے رگ و ریشے میں یہ فلسفہ سرایت کر گیا تھا۔ اور میرے جیسے وہ طالبِ علم جنہوں نے مغربی علم و حکمت

سے کے سرچشمے سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا تھا، فطرتِ جیوانی کا یہ راز سمجھ گئے کہ حکمت و دانش کی باتیں سکھانے کے لئے ہوتی ہیں عمل کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ جرمنی کے وہ فلسفی جنہوں نے زمین پر رینگنے والے کیڑوں کی زندگی کی قدر و قیمت سکھائی تھی، اپنے اقتدار کے نشے میں انسانی زندگی کو بے حقیقت سمجھنے لگے۔ جرمنی کے وہ طبیب جنہوں نے آلامِ انسانی کو مٹانے کے لئے ہر درد کی دوا اور ہر دکھ کا دارو ڈھونڈھ لیا تھا، اب اسی انسان کی ہلاکت و تباہی کی تدبیریں تلاش کرنے لگے اور جرمنی کے وہ مدبّر جنہوں نے دنیا کو حکومت اور سیاست کے گر سکھائے تھے اب اسی دنیا کے لئے غلامی کی زنجیریں ڈھالنے لگے۔ لیکن آخرکار یہ ساری تدبیریں اس نتیجے پر منتج ہو گئیں کہ ظالم کا ظلم صرف اس لئے بڑھتا ہے کہ خود اسے اپنے حلقے میں محیط کر لے اور تباہی کا طوفان جب سمندر کے کناروں سے اچھل کر دور دور تک کی زمینوں کو بہا لے جاتا ہے تو خود اس سمندر کے ساحل کو بھی ڈھا دیتا ہے۔ پوانکرے، کلیمنسو اور فوش نے جو اس وقت فرانس میں برسرِ اقتدار تھے، اتحادیوں کی فتح اور

جرمنوں کی شکست کے بعد جرمنی کے اقتصادی اعتبار اور سیاسی وقار کو ایک ایسی مہیب ضرب لگائی کہ جرمنی مدت تک اُس چوٹ کا درد محسوس کرتا رہا۔ لیکن اِن فرانسیسی مدبّروں کو انتقام کے جوش میں یہ بات یاد نہ رہی کہ سانپ کو چوٹ لگا کہ زندہ نہیں رہنے دیتے اور شیر کو زخمی کر کے بن میں نہیں چھوڑ دیتے۔ بہرحال انسان کی عقل محدود ہے اور اس کے عِلّت و معلول کا سِلسلہ کوتاہیوں اور غلط اندیشوں سے خالی نہیں۔ سانپ نے پھر کینچلی بدل لی۔ اور شیر کا زخم مندمل ہو گیا بیس برس کے بعد المانوی اقوام پھر غارت گری کے ایک نیئے دستور العمل کو اپنا پیرایۂ کار بنا کہ اپنی جغرافیائی حدود سے باہر نکل آئیں اور کچھ اِس شِدّت اور سرعت سے چھوٹے ملکوں اور کمزور قوموں کے امن و عافیت پر حملہ آور ہو گئیں کہ آن کی آن میں وسطی یورپ کا نقشہ بدل گیا اور اگر پھر اس آڑے وقت برطانیہ کی شرافت اور شجاعت، روس کی پامردی اور جفاکشی اور امریکہ کی فراست اور دُور اندیشی یورپ کو اِس طوفانِ برق و باد سے بچانے کے لئے معرکۂ کارزار میں نہ اُتر آتی تو یورپ کب کا کسی بلبلِ نامراد کے آشیاں کی طرح

اِس طوفانِ برق و باد کے نذر ہو کر ایک مشتِ خس و خاشاک ہو جانا دنیا کی اُن تمام قوموں کی فکر و غور کے لئے جو آزادی کا یہ مفہوم سمجھتی ہیں کہ طاقت سے زیر دستوں کو مغلوب کر کے کھُل کھیلیں اور اپنی من مانی کریں یورپ کے پچھلے پچیس برس کی تاریخ میں عبرت کا ایک نظر افروز سبق موجود ہے۔ سیاسیاتِ یوُرپ کے ماہر آج اس بات پہ متفق ہیں کہ اگر پہلی جنگِ عظیم کے بعد یوُرپ کی بڑی بڑی سلطنتوں میں ہر طرح کے سامانِ حرب کی تیاری اور گوناگوں عساکر کی فراہمی کے امکانات پر پابندیاں عائد کر دی جائیں تو اسے وہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا جو اُسے ۱۹۳۹ء میں دیکھنا پڑا۔ طاقت کا انفرادی یا اجتماعی استعمال اگر حق کی حمایت اور ظلم کی بیخ کنی کے لئے ہے تو طاقت اللہ کا ایک گراں قدر عطیہ ہے لیکن اگر اس کا استعمال حق کی بیخ کنی اور ظلم کی حمایت کے لئے ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ طاقت شیطان کا سب سے مہیب ہتھیار ہے۔

مجھے اُس وقت بھی حیرت تھی اور آج بھی حیرت ہے کہ اب جب کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب تمام زبانوں میں ہو چکا ہے، لوگ اُس کی حکمتوں سے کیوں سبق

نہیں سیکھتے۔ اور خدا کے کلام کی مصلحتوں سے قطع نظر کر کے انسان کی اُن تدبیروں پر کیوں عمل پیرا ہوتے ہیں۔ جن کے ہولناک عواقب ہمیشہ نوع انسانی کی ہلاکت اور آبادیوں کی بربادی پر منتج ہوئے ہیں۔ مختلف اقوام عالم کے اِنہیں غیر منصفانہ رجحانات کو مدِّ نظر رکھ کر اور اِسی تفوّق اور تغلّب کے میلان کا جائزہ لیکر جو نوعِ انسانی کی ایک نسل کے افراد کو اُس کی کسی دوسری نسل کے افراد کے فطری حقوق پر مائلِ استیلاء کرتا ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:-

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى

أَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

اِن آیاتِ بیّنات میں قرآن معاشرتِ انسانی کے نظام کو قائم اور دنیا کے امن و امان کو برقرار رکھنے کے لئے ان ازلی قوانین کا ذکر کرتا ہے جو تحفّظِ امن اور انضباطِ تمدّن کے لئے ضروری ہیں۔ انسان کا بے دریغ اور ناحق قتل، کسی قوم کا اس کے وطن سے اخراج، محکوم اور کمزور افراد پر ظلم اور آزاد انسانوں کو زرخرید غلام بنانے کا رواج، قرآن کے نزدیک ایمان اور اسلام کے اصول کے بالکل مخالف اور متضاد ہے۔ جو افراد اللہ کی پرستش اور اس کے احکام کی تعمیل کا عہد کرنے کے باوصف اِن افعال کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ اپنے عہد کے اُس اصل الاصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں جو اُن پر بنی نوعِ انسان کے باہمی تعلقات کے متعلق کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اللہ کی تعلیم کے ایک حِصّے کی تعمیل اور دوسرے حِصّے کی خلاف ورزی قرآن کے نزدیک کفر ہے اور معاشرتِ انسانی کے نظام کو

برقرار رکھنے کی ذمّے داری کا احساس ایمان کا ایک لازمی جزو ہے۔ قرآن اُس شخص کو نورِ ایمان سے محروم سمجھتا ہے جو تمدّن و تہذیب کے اِس بلند معیار تک نہیں پہنچتا۔ قرآن پیغام دیتا ہے کہ جو اقوامِ بنی نوعِ انسان کے ان ازلی اور فطری حقوق کو مدِّ نظر نہیں رکھتیں۔ ان کے لئے بڑی عبرتناک سزائیں مقرر کی گئیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ اپنی عظمت و حشمت کی بنیاد استبداد پر قائم کرے۔ قرآن انسان کی زندگی کا احترام سکھاتا ہے۔ قوموں کو اُن کے آبائی وطن میں رہنے کا حق دیتا ہے۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکتا ہے اور صاف صاف ارشاد فرماتا ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ سونے اور چاندی کے عوض انسان کی آزادی کو خرید لے اور اُس کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر پایۂ انسانیت سے گرا دے۔ جو ایسا کرتا ہے وہ قرآن کے نزدیک مجرم اور گنہگار ہے اور اُس کی سطوتِ عارضی اور بے بنیاد ہے۔ اے کاش! ممالکِ مشرق و مغرب کی اقوام اِس پیغام کو اب بھی سُن لیں۔ اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں اور پھر انسان اِن گمراہ کرنے والے

فلسفوں اور فلسفیوں کے اُس ظلم سے نجات پا جائے جو چند افراد کے اقتدار کا جھوٹا محل ساری نوعِ انسانی کے حقوق کے کھنڈر پر تعمیر کرتا ہے۔ آدمؑ اور شیطان کا قصّہ سب کو یاد ہے۔ مگر کتنے تھوڑے انسان اِس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شیطان نے آدم کو امن و عافیّت کی جنّت سے نکالنے کے لئے اور اُس مسجودِ ملائک کو اس کے پایۂ عظمت سے گرانے کے لئے آخر یہی نسخہ تو استعمال کیا تھا "اے آدم! تجھے میں ایک ہمیشہ رہنے والی سلطنت کو حاصل کرنے کے راز سکھاؤں!"

حیدر آباد دکن میں اعلیٰ حضرت حضورِ نظام کے دُودمانِ آصفیہّ کے علاوہ تین مسلمان اکابر کے خاندان بہت عالی مرتبت ہیں اور پائیگاہوں کے لقب سے مشہور ہیں۔ اُس وقت پائیگاہِ اوّل کے امیرِ اکبر سر آسمان جاہ بہادر کے بیٹے نواب معین الدّولہ بہادر، پائیگاہِ دوم کے امیرِ کبیر نواب خورشید جاہ بہادر کے بیٹے نواب ولی الدّولہ بہادر اور پائیگاہِ سوم کے نواب لطف الدولہ بہادر مالک و مختار تھے۔ یہ تینوں خاندان حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی

اولاد سے ہیں اور اِن کو دنیاوی حشمت و ثروت کے باوجود اس تعلق پر بڑا ناز ہے۔ جب یہ آسمان جاہ اور خورشید جاہ پاکپٹن شریف حاضر ہوتے ہیں تو حضرتِ گنج شکرؒ کے روضۂ اقدس کی خاکِ پاک ہی کو آسمانِ رفعت اور مطلعِ انوار سمجھتے ہیں۔ یہ طبل و علم کے مالک اور حشم و خدم کے مختار میلوں پا پیادہ چل کر پاکپٹن شریف پہنچتے ہیں۔ امیرِ اکبر اور امیرِ کبیر ہونے کے باوصف یہاں فقیروں کی طرح آتے ہیں اور فقیروں ہی کی طرح رہتے ہیں۔

نواب ولی الدّولہ بہادر ایک مدّت تک انگلستان میں قیام کرنے کے بعد جب حیدر آباد واپس آئے تو یہی ارادت ان کو پاکپٹن شریف کھینچ لائی۔ میں ان کی خدمت میں سب سے پہلے یہیں باریاب ہوا۔ بہت خوبصورت آدمی تھے۔ اردو بہت کم جانتے تھے۔ سامنے کا ایک دانت سونے کا تھا۔ انگریزی زبان کے عالِم اور بینجو کے ماہر تھے۔ ان کا ایک حبشی غلام احمدؐ حبب عربی میں نعت گاتا تھا۔ تو یہ عاشقِ رسولؐ بینجو بجاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ اِس مرتبہ کوئی چھ مہینے تک پاکپٹن شریف میں رہے

آستانہ مبارک کے اندر درویشوں کے ایک حجرے میں ایسے رہتے تھے۔ جیسے کوئی فقیرِ بے نوا رہتا ہے۔ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کچی مٹی کے اس چھوٹے سے حجرے کے اندر جو شخص کھجور کی چٹائی پر بیٹھا ہے اور جس کے سامنے پانی پینے کے لئے مٹی کا ایک آب خورہ اور کھانا کھانے کے لئے مٹی ہی کا ایک طباق رکھا ہے، قلمروِ آصفیہ کے امیرِ کبیر نواب خورشید جاہ بہادر کا چشم وچراغ اور حیدر آباد کی پائیگاہِ ثانی کا وارثِ نام و نگین ہے۔ میں ہی پاکپتن شریف میں ایک ایسا شخص تھا، جس سے وہ انگریزی میں بلا تکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ اس لئے میں اکثر اُن کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ دنیاوی آسائشوں کی آغوش میں پرورش پا کر بھی انسان ایسی فطرت رکھ سکتا ہے، اِسے کون مانے گا۔ مگر جو سعادت اس مردِ حق کی منتظر تھی، جب اسے حاصل ہوئی۔ تو دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ امیرِ باحشم جس کا تجمّل بے مثال اور لازوال تھا، اپنے سینے کے اندر ایسا دل رکھتا تھا۔ جو عشقِ رسولؐ کے آب و گِل سے بنا تھا اور جب وہ قیدِ ہستی سے آزاد ہوا تو اُس کی مٹی جہاں کا خمیر تھی اُس مٹی میں جا ملی۔

۱۹۳۷ء میں یہ عاشقِ رسولؐ حج کے لئے مکّہ معظمہ حاضر ہوا۔ اور حج سے مشرّف ہو کر دیارِ حبیبؐ میں جا پہنچا۔ صحت کی جس کیفیت کو لوگ اُس وقت ناسازیٔ طبع کہتے تھے، ساز گاریٔ روزگار تھی۔ اور جس جلن کا نام اس وقت طبیبوں نے بخار تجویز کیا، عشقِ رسولؐ کے شغلوں کی تپش تھی۔ یہ ناسازیٔ طبع بڑھتی چلی گئی، یہ بخار چڑھتا چلا گیا۔ لیکن یہ حفظِ مراتب کا پابند امیر، مکارمِ ادب کو نہ بھولا۔ ہر روز فجر کی نماز سے پہلے ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا تھا۔ اور روضۂ نبویؐ پر حاضر ہو کر مہجوری و فراق کی وہ پیاس بجھاتا تھا جس نے برسوں سے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔ آخر فراق کا وقت ختم ہو گیا۔ مہجوری کی منزلیں طے ہو گئیں۔ اُس عاشقِ صادق کی روح ایک دن حبیبِ خداؐ کے قدموں میں پہنچ کر قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ آج وہ جنّت البقیع میں مدفون ہے۔ یہ وہی خاکِ پاک ہے جسے عشق والے جنّت سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور جو محبّت کی کائنات کا عرشِ اعظم ہے۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

جب ہم لوگ حیدر آباد پہنچے۔ تو دیکھا کہ یہ تینوں ریاستیں حضرتِ گنج شکرؒ کے سجادہ نشین کے قدموں کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں۔ اور دولتِ آصفیہ کے اِن تینوں امراء میں سے ہر ایک اپنے دادا کے صاحبِ سجّادہ کو اپنا اپنا مہمان بنانے کے لئے چشم براہ ہے۔ آخر فردوس مکان عرش آشیان اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان بہادر کی ہمشیرۂ محترمہ اور نواب معین الدولہ بہادر کی والدۂ ماجدہ جو پاشا حضرت کے بلند مقام لقب سے ملقب تھیں کا ارشاد واجب التعمیل سمجھا گیا۔ اور دیوان صاحب ان کے قصرِ معلیٰ میں جو خانہ باغ پیلیس کہلاتا ہے مقیم ہو گئے۔

دیوان صاحب جب سیر و شکار کو نکلتے۔ تو ان کے ساتھ ان کے اپنے خادموں اور ارادتمندوں کی اتنی کثیر تعداد ہوتی تھی۔ کہ ایک اچھا خاصا لشکر دکھائی دیتا تھا۔ اِس پر سفر کا بے حساب ساز و سامان اور بے اندازہ رسد۔ خانہ باغ پیلیس میں پاشا حضرت اور نواب معین الدّولہ بہادر کے حرمِ محترم کی سکونت تھی۔ اِس لئے اس میں اتنی جگہ نہ تھی۔ کہ دیوان صاحب کے تمام رفقائے سفر کی سمائی ہو سکتی۔

دیوان صاحب اور میں تو خانہ باغ پیلیس میں ٹھہرے اور باقی لوگ نواب معین الدّولہ بہادر کے اس عظیم الشان اور یگانۂ روزگار محل میں جو بشیر باغ کے نام سے مشہور ہے، مقیم ہو گئے۔ نواب معین الدولہ بہادر پر اُس وقت شباب کا عالم تھا۔ اُن کے صاحبزادے نواب ظہیر الدین کی عمر اس وقت کوئی تین چار برس کی ہو گی۔ محل سرا میں ان کو پیار سے صابر پاشا کہتے تھے نواب معین الدولہ بڑے خوددار، بڑے وجیہ و شکیل اور بڑے شجیع و بہادر انسان تھے۔ بے سدھے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے دو چار قدم ہی میں رام کر لیتے تھے۔ شیر کے شکار کا ایسا شوق تھا کہ ان کے قصرِ جہاں نما کی ساری دیواریں اُن شیروں کی کھالوں سے ڈھنپی ہوئی تھیں جو انہوں نے اپنی مشقِ صید افگنی میں اپنے ہاتھ سے شکار کئے تھے۔ بات کے ایسے پکّے تھے کہ جو لفظ منہ سے نکل جاتا۔ پتھر کی لکیر ہو تا۔ لکھ لٹ ایسے تھے کہ ایک مرتبہ دِلّی میں دو چار گھنٹوں ہی میں لاکھوں روپے لٹا دیئے۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ حیدر آباد میں شاید ہی کوئی ایسا گھرانا ملے جو اُن کا مرہونِ منّت نہ ہو۔ آنکھوں میں وہ لحاظ تھا کہ بچوں سے

بھی آنکھ نہ ملاتے تھے۔ سادگی کا یہ حال تھا کہ لٹھے کے چوڑی دار پاجامے اور سیاہ گرگابی، معمولی کشمیرے کی حیدرآبادی اچکن اور ہلکی سی ٹوپی کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہ پہنتے تھے جس سے اُن کے مرتبے کی عظمت اور شان و شوکت ظاہر ہو۔ ان کے اصطبل میں گھوڑوں کی جگہ بیسیوں موٹر کاریں تیار کھڑی رہتی تھیں اور ان کے حضور سینکڑوں خُدّام کمر بستہ حاضر رہتے تھے۔ وہ اس قدر قوی ہیکل اور فولاد پیکر انسان تھے کہ جب میں نے ۱۹۴۲ء میں ان کی ناگہاں وفات کی خبر سُنی تو مجھے یقین نہ آیا۔ اللہ اُن کے صاحبزادے نواب ظہیر الدین بہادر کو تا ابد سلامت رکھے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ صابر پاشا اپنی گورنس کی انگلی پکڑے خانہ باغ پیلیس کے چمن میں ٹہل رہے تھے۔ خدا جانے! انہیں کیا خیال آیا۔ ایک گلاب کا پھول ٹہنی سے توڑ کر مجھے دیا۔ میں نے اِس معصوم امیرزادے کے اِس تحفے کو نعمتِ خداوندی جانا۔ پھول کو چوما آنکھوں سے لگایا اور کہا۔ "آپ کا یہ تحفہ میں اپنے پاس رکھوں گا۔ جب آپ خیر سے بڑے ہو جائیں گے تو حیدرآباد آؤں گا اور اسے ساتھ

لاؤں گا۔ آپ اِسے نہ بھول جائیے گا"۔ مَیں نہیں جانتا۔ وہ اس اس وقت میری بات سمجھے یا نہیں مگر تو تلی زبان سے فرمایا "نہیں"۔ وہ پھول اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو کسی دن جاؤں گا اور اس کی سوکھی ہوئی پتیاں دکھا کر اپنے دل کا غنچہ کھلاؤں گا۔

صابر پاشا کی گورنس کوئی معمولی گورنس نہیں تھیں۔ حیدرآباد کے امیرِ اکبر کے پوتے کی شان کا تقاضا یہی تھا۔ کہ اس کی گورنس ایسی ہی ہو۔ ڈیزی راشفورٹ کا سلسلۂ نسب براہِ راست اُس کونٹ راشفورٹ سے جا ملتا تھا جو فرانس کی عظمت کے زمانے میں کارڈینل رِشلو کا جاں نثار دوست تھا اور بعد میں کارڈینیل مازارین کا خوفناک حریف ثابت ہُوا۔ اور جو ڈیوک واہار کورٹ، فانٹ ریلیز، ورائیو اور دوسرے فرانسیسی اُمرا کی ریشہ دوانیوں کی بدولت پانچ برس تک بیسٹل کے ہیبت ناک اور پُراسرار قید خانے میں زندہ درگور رہا۔ راشفورٹ کا خون شرافت کی ایسی سند ہے کہ فرانس میں اُس کی قسم کھائی جاتی ہے اور جس کی رگوں میں راشفورٹ کا خون ہو اسے بلا تحقیق شریف اور نجیب مان لیا جاتا ہے۔ مَیں نے اِس روایت کا

ثبوت اپنی آنکھوں سے ڈیوڈی راشفورٹ کی صورت اور سیرت میں دیکھا۔

ڈوپلے نے اپنی گورنری کے زمانے میں جب لابورڈونے کا عہد نامہ منسوخ کر دیا۔ تو اُسے دکن اور کرناٹک میں فرانسیسی اقتدار بڑھانے کی اہمیت محسوس ہوئی۔ نظام الملکؒ کی وفات نے ڈوپلے کی شاطرانہ چال بازیوں کے لئے ایک نادر موقع بہم پہنچا دیا۔ اس نے اپنے سیاسی رسوخ اور عسکری اقتدار سے کام لے کر مظفر جنگ کو حیدر آباد کے تخت پر اور چندا صاحب کو کرناٹک کے تخت پر بٹھا دیا۔ اور خود جنوبی ہند کا گورنر بن بیٹھا۔ اسی سیاسی فتح کی یادگار میں اس نے ڈوپلے فتح آباد کا شہر تعمیر کیا۔ جنوبی ہند میں ڈوپلے کو فوری اقتدار تو حاصل ہو گیا مگر اُس نے یہ بات ضروری سمجھی کہ حیدر آباد اور کرناٹک کے دارالحکومتوں میں ہشیار اور تجربہ کار فرانسیسی عہدے دار متعیّن کرے تاکہ وہ فرانسیسی تسلّط کی حفاظت اور انگریزی تاثر کی مدافعت کر سکیں۔ ان فرانسیسی عہدے داروں میں جو حیدر آباد کے دربار میں مقرر ہوئے۔ ڈیوڈی راشفورٹ کے دادا کرنل راشفورٹ بھی تھے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ دکن میں

فرانسیسوں کے اقبال کا سورج غروب ہو گیا۔ مگر ہندوستان کی جنوبی فضا پر یہ فرانسیسی ستارے چمکتے رہے۔ اور اُن کو یہ آب وہوا کچھ ایسی راس آئی کہ حیدرآبادیوں کے ساتھ حیدرآبادی بن گئے۔ ڈیزی راشفورٹ حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ مگر انہوں نے تعلیم انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی میں پائی۔ اُن کے رنگ میں فرانسیسی ملاحت تھی مگر لب ولہجہ انگریزی تھا۔ انگریزی زبان میں بہت اچھّا شعر کہتی تھیں۔ اُن کی تحریر میں مُصنّفانہ رنگ تھا اور ان کی تقریر میں عالمانہ انداز۔ فرانسیسی اُن کی مادری زبان تھی اور اُردو حیدرآباد کے امرار کی طرح بولتی تھیں۔ انگریزی لباس سے زیادہ مغلئی لباس پسند کرتی تھیں۔ موسیقی کی ماہر تھیں، اور پیانو تو ایسا بجاتی تھیں کہ مَیں نے آج تک ایسی دسترس کسی اور میں نہیں دیکھی۔ جب تک ہم لوگ حیدرآباد میں رہے۔ میری ان سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اور اکثر ایسا ہوتا تھا۔ کہ ہم مشرقی اور مغربی لٹریچر کے محاسن بیان کرتے کرتے گھنٹوں گزار دیتے تھے۔ جب مَیں حیدرآباد سے واپس آگیا۔ تو مدت تک میری ان کی خط وکتابت رہی۔ ۱۹۱۷ء میں یہ عالی نسب خاتون اپنے شریف خون کی غیرت سے مجبور ہو کر اپنے آباؤ اجداد کے

وطن کی عزت پر قربان ہونے کے لئے ریڈ کراس کی نرس بن کر فرانس چلی گئی اور ایک ہنگامۂ کارزار کے دوران میں شہید ہو گئی۔ ڈیزی راشفورٹ نے ثابت کر دیا کہ راشفورٹ کا خون سالہا سال تک ہندوستان کی آب و ہوا سے متاثر ہونے کے بعد بھی ویسا ہی گرم تھا اور وطن کے وقار کو اطالوی اقتدار سے بچانے کے جرم میں جو سختیاں کونٹ راشفورٹ نے بیسٹیل میں جھیلیں تھیں، رائیگاں نہ گئیں۔ صدیوں کے بعد ڈیزی راشفورٹ نے فرانس کو جرمن اقتدار سے بچانے کے لئے اپنی بساط کے موافق وہ قربانی کی جس کی حیثیت کسی بڑی سے بڑی قربانی سے محض اِس لئے کم نہیں سمجھی جا سکتی کہ وہ فرانس کی ایک گمنام اور دور افتادہ بیٹی نے کی۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اب اِن امرا کی مہماں نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہم کبھی تو بیگم پیٹھ میں نواب ولی الدّولہ بہادر کے قصرِ معلّٰی میں اُن کی مختلفُ الالوان ضیافتوں میں شریک ہوتے اور کبھی خانہ باغ پیلیس میں نواب معین الدّولہ بہادر اور پاشا حضرت کی شاہانہ

مدارات کی آسودگی میں اپنے شب و روز بسر کرتے۔

دیوان صاحب کی ناگہاں علالت کے باعث ان کا پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور ہم اعلیٰ حضرت بادشاہِ دکن کی خدمت میں باریاب ہونے سے محروم رہ گئے۔ اگرچہ یہ سعادت رسمی طور پر مجھے نصیب نہ ہوئی۔ مگر حسنِ اتفاق سے میری آنکھیں اسلامی عظمت کی اُس آخری یادگار کے نظارۂ جمال کی سعادت سے ایک دن بہرہ یاب ہو ہی گئیں۔

میں "عابد کی شاپ" کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ دفعتہً سیٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سیٹیوں کا بجنا تھا کہ سب راہرو سڑک کے دونو طرف صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ میں نے یہ کیفیت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ اعلیٰ حضرت کی سواری آتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کا موٹر دیکھتے ہی سب لوگ جھک گئے۔ اور مغلئی طریق پر حیدرآبادی انداز سے آداب بجالانے لگے۔ سرِ نیاز خم کرنے سے پہلے میں نے ایک نظر اعلیٰ حضرت کو دیکھ لیا۔ اُس کائناتِ خوبی و کمال اور آسمانِ رفعت و جلال کو ایک نظر دیکھنے سے اس کی عظمتوں کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے۔

کہ قسمت کی یاوری سے خوبیٔ تقدیر کی یہ چلتی پھرتی تصویر ایک لمحے کے لئے آنکھوں کے سامنے آکر گزر گئی۔ مَیں نے اعلیٰ حضرت کے ذاتی اوصاف اور اُن کے مکارمِ اخلاق کے متعلق اُس وقت جو کچھ سُنا۔ اُسے اب دنیا جانتی ہے۔ بزرگانِ سلف کی زندگی کی سادگی اگر آج مسلمانوں کے کسی تاجدار کی زندگی میں منعکس نظر آتی ہے۔ تو وہ آصف جاہ نظامُ الملک اعلیٰ حضرت میر عثمان علی بہادر خسروِ دکن ہی کی ذاتِ مبارک ہے۔

جب مَیں نے عثمان ساگر کا سنگِ بنیاد دیکھا۔ تو مَیں نے اُس دُور اندیش اور عاقبت بین بادشاہ کی وسعتِ نظر کا اندازہ کیا جس نے اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اُس ساگر کی بنا ڈالی جو برسوں کے بعد قلمروِ آصفیہ کی رعایا کے لئے ابرِ رحمت اور بحرِ نعمت ثابت ہؤا۔ عثمان ساگر ہی کا کیا ذکر۔ جب سے اعلیٰ حضرت مسند آرائے حکومت ہوئے ہیں۔ نظم و نسق کا کونسا شعبہ ہے جس نے بے مثال ترقی نہیں کی اور رفاہِ عامہ کا کون سا محکمہ ہے جو رعایا کے لئے لازوال نعمتوں کا سرچشمہ نہیں بن گیا۔ عثمان ساگر نے زمین کی پیاس بجھائی۔ عثمانیہ

یونیورسٹی نے دل اور دماغ کی پیاس بجھائی اور میر عثمان علی خاں نے اُن آنکھوں کی پیاس بجھائی جو اسلامی تاجداروں کی پرانی عظمت کو ایک بار پھر دیکھنے کی پیاسی تھیں۔

قلمروِ آصفیہ کے دارالحکومت کی شان و شوکت کی روئداد اور حضورِ نظام اور ان کے اُمراء کے قصروں اور محلوں کے ساز و سامان کی داستان الف لیلے کی ضخامت چاہتی ہے۔ یہاں اتنا کہہ دینا بس ہے کہ اِن چیزوں کو دیکھ لینے کے بعد اب کسی چیز کو دیکھنے کی حسرت نہیں رہی۔

دیوان صاحب کی علالت کے باعث دفعتہً مراجعت کی تیاری ہو گئی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے نواب ولی الدولہ بہادر نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ حیدر آباد کی ملازمت میرے لئے ایسی ممکنات رکھتی ہے جو کہیں اور میسّر نہیں آ سکتیں۔ میری پرانی نیاز مندی کی وجہ سے وہ مجھ پہ بہت مہربانی فرمانے لگے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ میں اُن کی نظر سے دُور رہوں۔

حیدر آباد سے واپس آ کر میں کوئی تین مہینے تک پاکپٹن شریف میں دیوان صاحب کے حضور حاضر رہا۔ اور اُن کی

تیمارداری کی خدمات انجام دیتا رہا۔ میں نے اِس فرصت کے دوران میں اپنے مستقبل کے متعلق بہت کچھ سوچا۔ آخرِ کار نواب ولی الدولہ بہادر کی تجویز ہی سب ارادوں اور تدبیروں سے زیادہ کارآمد اور امید افزا نظر آئی اور میں ملازمت کے ارادے سے حیدر آباد روانہ ہوگیا۔ نواب معین الدولہ اور نواب ولی الدولہ میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوتے اور اپنی نوازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انہوں نے وہ بات کی جس کی مثال حیدر آباد کے امراء کی تاریخ میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ پُرانی روایات کے مطابق حیدر آباد کے اِن امراء کو یہ حق حاصل ہے کہ جب کبھی یہ سلطنت کے کسی سرکاری عہدے دار سے ملنا چاہیں تو اُسے اپنی حضوری میں طلب فرماسکتے ہیں۔ خود نہ تو کسی عدالت میں جاتے ہیں اور نہ کسی عہدے دار کے گھر پر۔ مگر نواب معین الدولہ اور نواب ولی الدولہ مجھے اپنے ساتھ لیکر سر اکبر حیدری کے دولتکدے پر تشریف لے گئے۔ سر اکبر حیدری اس زمانے میں حیدر آباد کے وزیرِ مالیات تھے۔ انہوں نے امیرِ اکبر اور امیرِ کبیر کے صاحبزادوں کو اپنے مکان پر دیکھا تو سمجھے آسمان زمین پر اتر آیا۔ دست بستہ استقبال کیا اور صورتِ حال

سے واقف ہونے کے بعد مجھ سے ملازمت کے متعلق میری پسند اور انتخاب کے بارے میں استفسارات فرمائے۔ میں پڑھنے پڑھانے کے مشغلے سے تازہ تازہ ہی فارغ ہوا تھا۔ اِس کے سوا اور کچھ نہ سوجھی۔ سر اکبر حیدری نے اسی وقت ایک خط مسٹر آلما لطیفی کے نام لکھا اور میرے حوالے کیا۔

مسٹر آلما لطیفی اُن دنوں حیدر آباد کے سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ اور اُس وقت گلبرگہ شریف میں مقیم تھے۔ سر اکبر حیدری کا خط لیکر میں ان کے پاس گلبرگہ شریف گیا۔ جمعے کا دن تھا۔ میں نے حضرت گیسو دراز علیہ الرحمۃ کے مزارِ اقدس کی مسجد میں جمعے کی نماز ادا کی۔ نماز پڑھتے ہی میں مسٹر آلما لطیفی سے ملنے چلا گیا۔ اور یہ سُن کر حیران ہو گیا کہ وہ شخص جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اُس کی صورت اور سیرت مغربی ہے اور وہ اسلامی ثقافت اور ہندوستانی تہذیب کا دشمن ہے، نماز میں مشغول تھا۔ لوگ صورت دیکھ کر انسانوں کی سیرت کا اندازہ لگانے میں کتنی غلطی کرتے ہیں۔ سنی سنائی باتوں پر کس قدر اعتبار کرنے لگ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے زیادہ کانوں سے کام لیتے ہیں، یہ اُس دن معلوم ہوا۔

مسٹر آلما لطیفی نے سر اکبر حیدری کا خط پڑھا تو فرمایا "آپ کو کونسی جگہ پسند ہے" میں نے عرض کی "محکمۂ تعلیم میں کوئی سی جگہ بھی ہو مجھے پسند ہو گی" انہوں نے میرے لئے سٹی سکول حیدر آباد کی سیکنڈ ماسٹری یا کسی پرگنے کی انسپکٹری تجویز فرمائی۔ ان دونوں عہدوں کا ماہوار مشاہرہ ہزار ہزار روپے تھا۔ مسٹر فضل محمد خاں کیمبرج کے سینئر رینگلر اُس وقت سٹی سکول حیدر آباد کے ہیڈ ماسٹر تھے اور کوئی دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ جب انہوں نے یہ بات سُنی تو بہت خوش ہوئے اور مجھے اسکول میں لینے کو تیار ہو گئے۔ مگر مسٹر آلما لطیفی نے باتوں باتوں ہی میں سب مجھے یہ نکتہ سمجھا دیا تھا کہ حیدر آباد میں غیر ملکیوں کے لئے اب ترقی کی کوئی توقع نہیں اور جس شخص کی ساری بساط صرف اُمراء ہی کی سرپرستی ہو، اس کی اقبال مندی ایک مبہم سی چیز ہے۔

مسٹر آلما لطیفی انڈین سول سروس کے ایک معزز رکن تھے اور ان کا تقرر پنجاب میں ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھے یہی مشورہ دیا۔ کہ میں پنجاب ہی میں کوئی اچھی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کروں۔

میں نے جب نواب ولی الدولہ بہادر سے یہ ساری

کیفیت بیان کی تو وہ اتنے خشمگیں ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ فرمایا "ہم اِس حکومت کے ستون ہیں۔ یہ غیر ملکی لوگ ہمیں بھی اس قدر کمزور اور ناقابلِ اعتبار سمجھنے لگے!" پھر خود بخود ہی یہ فیصلہ کیا۔ کہ جب تک کسی اچھی ملازمت کا انتظام نہ ہو جائے مَیں ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرے پر اُن کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتا رہوں۔ یہ محض ایک بہانہ تھا۔ حقیقت میں وہ چاہتے تھے کہ مَیں حیدر آباد میں رہوں اور انہیں کے پاس رہوں۔

اِس مرتبہ اگرچہ مَیں حیدر آباد میں کوئی دو مہینے تک مقیم رہا۔ مگر جہاں تک مجلسی ارتباط کا تعلق ہے۔ مَیں حیدر آباد کے لوگوں سے بیگانہ ہی رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیدر آباد کے جن امراء کے ہاں مَیں آتا جاتا تھا۔ ان کے ملنے والوں کا حلقہ بہت ہی محدود اور مخصوص تھا۔ تاہم مَیں اِسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ کم از کم میری ملاقات حیدر آباد کے دو نوجوان امیر زادوں سیّد محمود علی اور آغا ابو الحسن سے تو ہو گئی۔ یہ دونو ابھی ابھی آکسفورڈ سے واپس آئے تھے۔ محمود علی آسکر وائیلڈ کے دیوانے تھے۔ مَیں بھی اُس زمانے میں اُس کی انگریزی کا

مداح اور اُس کے اسلوبِ نگارش کا شیدا تھا۔ یورپ میں مارلو، بین جانسن، شیکسپیئر اور شیریڈن کا بازار سرد ہو چکا تھا۔ ہنریک ابسن میٹر لنک، برنرڈ شا اور کونٹ ٹالسٹائے رفتہ رفتہ منظرِ عام پر آکر اپنی جدّت آفرینی کا سکّہ جما چکے تھے۔ چیکوف، گالزوردی اور دوسرے مجازی تمثیل نگاروں کو اگرچہ ابھی وہ شہرت حاصل نہ ہوئی تھی جس پر وہ اپنا استحقاق ثابت کر رہے تھے لیکن یورپ کے تمام نقّادانِ ادب اب اِس بات پر متفق ہو چلے تھے۔ کہ ادب کی وہ صنف جسے ڈراما کہتے ہیں۔ اب نظم کی جنس سے نکل کر نثر کی جنس میں آگئی ہے۔ اور یہ انتقالِ جنس اس کے ارتقار کا لازمی نتیجہ ہے۔ گفتگو میں تخیّل کی رنگینیوں کی کوئی جگہ نہیں۔ وہی زبان جو روز مرّہ کہلاتی ہے۔ صحیح محاورے اور اندازِ تکلّم کے مطابق ڈرامے کی زبان ہونی چاہیئے۔ اور انہیں حالات اور واقعات کو جن سے انسان زندگی میں روزانہ دوچار ہوتا ہے۔ ڈرامے کا پس منظر بنانا چاہیئے یہ نکتۂ خیال یورپ کے دماغ پر اس قدر ساری و طاری ہو گیا۔ کہ لوگ شیکسپیئر کی معجز نگاری کو محض تخیّل کی ہنگامہ آرائی سمجھنے لگے۔ اور روز مرّہ کے واقعات روز مرّہ زبان میں لکھ دینے ہی

کو حقیقت نگاری کہنے لگے۔ تاہم اس وقت میری طرح کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ڈرامے کو اب تک نظم ہی کا منتہیٰ تصوّر کرتے ہیں اور ڈرامے کی گفتگو کو نثر میں لکھنے کے باوصف شعر کی خصوصیّات سے عاری کرنا نہیں چاہتے۔ آسکر وائیلڈ کی تحریر اسی زاویۂ نگاہ کا مظہر تھی۔ جہاں اس کی زبان خالص انگریزی محاورے کے مطابق تھی۔ وہاں اس کے الفاظ کی بلندی اور تخیّل کی رفعت، صاحبانِ نظر پر یہ حقیقت روشن کر دیتی تھی۔ کہ اس کے چمن کی نسیم شیکسپیئر کے باغ کے پھولوں کی مہک سے معطّر ہو کر آئی ہے۔ اور وہ تخالفِ احساس اور بہمیٔ اظہار جو اس کی تحریر کا مابہ الامتیاز ہیں اور جن کی بدولت اُسکے نتائج فکر صنعتِ تضاد کا ایک نادر کرشمہ بن گئے، اُسی نور کا پرتو ہیں جس سے اریسٹافینز اور مالیئر کے تخیّل کی دنیا روشن رہی ہے اگرچہ آسکر وائیلڈ کا تجزیۂ حیات افلاطون کے اُس فلسفے کا ایک مسخ شدہ خاکہ ہے جس کی روح و رواں، روح اور حواس کا باہمی ردِّ عمل ہے اور اس کے تخیّل کی اصل تپ کے دہابِر کشش کی اسی جڑ سے پھُوٹی ہے جس نے روح کی بیماریوں کا علاج حواس کی اذیتوں میں اور حواس کی معصیّت انگاریوں

کا علاج روح کے اضمحلال میں تلاش کیا۔ لیکن پکچر آف ڈورین گرے میں ڈورین کی تصویر کو اُس نے جس نازک خیالی سے روح کی غیر مرئی مگر حسّاس صفات و دلبیت کی ہیں اور خود ڈورین کی جسمانی شخصیّت پر اس کی روح کے تاثرات اور انقلابات کو جس ندرتِ تخیّل سے منعکس کیا ہے بلاشبہ تخیّل اور نگارش کا ایک محیّر العقول معجزہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ آسکر وائیلڈ کی فطرت میں کچھ اس طرح رچ گیا تھا کہ اس کے افکار و اعمال اس کا فکری اور عملی اظہار بن گئے۔ اور جو کچھ اس نے لکھا یا اس کے منہ سے نکلا وہ روح و حواس کی اُسی پکار کی صدائے بازگشت تھی جو دن رات اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ آسکر وائیلڈ کی روئدادِ حیات اِسی یکجہتیٔ فکر و عمل کی المناک داستان ہے اور جن درد انگیز الفاظ میں اِس تلخ حقیقت کا اعتراف اُس نے ڈی پروفنڈِس میں کیا ہے وہ اُن لوگوں کے لئے ایک مینارِ نور کا کام دیتا ہے جو دوسروں کے علم کے تاریک اور اتھاہ سمندر میں غوطے لگا لگا کر اپنی عقل و دانش کی آراستگی کے لئے آبدار موتیوں کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں اور موتی یا سیپ قعرِ دریا سے جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے۔

اُسے خاتمِ فکر کا نگینہ بنا کر اپنی شہرت کی دُکان سجاتے ہیں۔

جرعۂ دزدید از جامِ من و میخانہ ساخت

آں کہ از کم ظرفیش رُسوا خرابا تم ہنوز

غرض بالکل اُسی طرح جس طرح ہندِ قدیم کے رشیوں کے سُندر شریر رُوح کی نجات کی تلاش میں تپ اور سنیاس کی اذیتوں سے سُوکھ سُوکھ کر بدہئیت اور کرخت ہو گئے تھے آسکر وائیلڈ کی خوبصورت روح حواس کی عشرت کوشیوں کی کاوش میں مسخ اور مکروہ ہو گئی۔ اخلاقِ انسانی کی تعمیر و تخریب کے مطالعے کے سلسلے میں آسکر وائیلڈ کی سیرت کے انقلابات اور اس کے ناولوں اور ڈراموں کے کیریکٹروں کی نفسیاتی کیفیتوں کا اس کی زبان سے اظہار میرے لئے ایک ایسی کشش رکھتا تھا کہ ایک مدت تک میں خود اُسی روشِ تخیل پہ چلتا رہا۔ اور اسی کے اسلوبِ تحریر کو اُردو زبان میں منتقل کرتا رہا۔ میرے مشہور اور مقبول افسانے حُسن کی قیمت، اندھا دیوتا اور گناہ کی رات اِسی دَور کی یادگار ہیں۔ مَیں نے اِن افسانوں میں آسکر وائیلڈ کو اسی کے ہتھیاروں سے شکست دینے کی کوشش کی ہے۔ اُس زمانے کے

نقّادانِ ادب اِس بات پر متفق تھے اور آج کل کے نقّادانِ ادب کو بھی اُن کی رائے سے اتفاق ہے کہ اُردو زبان میں آسکر وائیلڈ کے اسلوبِ تحریر اور پیرایۂ تخیّل کو مَیں نے جس ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ اردو زبان میں منتقل کیا آج تک ہندوستان کا کوئی دوسرا مصنّف نہیں کر سکا۔ اور جس دِقّتِ نظر اور صحتِ ادراک سے مَیں نے آسکر وائیلڈ کے بظاہر صحیح نظریوں کی نادرستی کو بے نقاب کیا ہے، ہندوستان کے کسی دوسرے افسانہ نویس یا ڈراماٹسٹ سے بن نہیں پڑا۔ یہ جگہ فلسفۂ حیات کے اُن افکار پر بحث کرنے کے لئے نہیں جو اعماقِ قلب و ذہن میں پیدا ہو کر انسان کے حواس کی احساسات اور اس کے اعضاء کے اعمال و افعال میں متشکل ہو جاتے ہیں اور جو میرے موسومۂ صدر افسانوں کا موضوع ہیں۔ آسکر وائیلڈ کے زاویۂ نگاہ کی تشریح سے مقصد فقط یہی تھا کہ ناظرین پر اُن رجحانات کی توضیح ہو جائے جو میری انشاپردازی کے پہلے دور کی تصنیفات کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئے تھے۔

یورپ کے اعلیٰ طبقے کی سوسائٹی کے معائب کو رینالڈز نے جس دیدہ دلیری سے بے نقاب کیا، وہ ذوقِ سلیم

رکھنے والوں کے نزدیک بارِ خاطر ہے۔ ماری کوریلی، مسز ہنری وڈ
اور آسکر وائیلڈ نے بھی اِسی طبقے کی غلط کاریوں کا نقشہ کھینچا۔
مگر اِس خوبصورتی سے کہ ان کی تصنیفات خود اسی طبقے کے
افراد میں مقبول اور محبوب ہو گئیں۔ مگر بالکل اُسی طرح جس طرح
ایک بدصورت انسان یہ تو برداشت کر سکتا ہے کہ اسے اپنی
بدصورتی کا علم ہو جائے لیکن اِس بات کو پسند نہیں کرتا کہ
کوئی دوسرا شخص اسے بدصورت کہے۔ یورپ کے اعلیٰ طبقے
نے اپنی کوتاہیوں اور اعتدال ناپسندیوں کی تصویر دیکھنی تو گوارا
کر لی۔ مگر دوسروں کی زبان سے اس تصویر کی تعریف سننا اور
اُس تصویر کے مصوّر کی صورت کو دیکھنا گوارا نہ کیا۔ مصنّف خواہ
افسانہ نویس ہو یا ڈراماٹسٹ، مضمون نگار ہو یا شاعر۔ حقیقت
میں مُصلح اور ناصح ہی کا ایک مقبولِ عام روپ ہے۔ اور وہ
مُصنِف جس کی تحریر کا مقصود بلاواسطہ یا بالواسطہ افرادِ نسلِ انسانی
کی اصلاح نہ ہو، مُصنفوں کے زمرے میں شمار کئے جانے
کا حق نہیں رکھتا۔ بعض مُصنف سوسائٹی کے اونچے طبقوں کی
اصلاح کو اِس لئے سوسائٹی کی عام اصلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں
کہ سوسائٹی کا طبقۂ اسفل امرا کی مثال کو قابلِ تقلید سمجھتا ہے اور

بعض سوسائٹی کے نچلے طبقوں کی اصلاح کو اِس لئے سوسائٹی کی بحیثیتِ مجموعی اصلاح تصوّر کرتے ہیں کہ اِن طبقوں کے افراد کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ تھیکرے، جارج ایلیٹ اور ڈکنزاُن مصنّفین میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں جنہوں نے یورپ کے نچلے طبقوں کی اصلاح کو اپنی تجربہ کا مآل اور اپنے تخیّل کی جولانیوں کا مقصود قرار دیا۔ لیکن اس حقیقت پر پردا نہیں ڈالا جا سکتا۔ کہ سوسائٹی کے نچلے طبقوں کے تمام معائب و جرائم افلاس کی گود میں پلتے ہیں اور اس بے جگری کی آغوش میں تربیت پاتے ہیں جو ناکامی اور مایوسی کا دودھ پی کر جوان ہوتی ہے۔ جب تک غریبی موجود ہے ان طبقوں کی اصلاح ناممکن ہے اور ظاہر ہے کہ غریبی افسانہ نویسیوں اور مضمون نگاروں کے بس کا روگ نہیں۔ یورپ کے وہ اربابِ فکر جو اشتراکیت کے قائل اور نوعِ انسانی کے طبقات کی ناہمواریوں سے متنفر ہیں۔ اس بات پر متفق ہوتے چلے جاتے ہیں کہ جب تک حکومت سخت گیر اور بے لحاظ قوانین کے آہنی ناخنوں سے سوسائٹی کے اقتصادی مسائل کی گرہ کشائی نہ کرے اور مفادِ عوام کو مدِّنظر رکھ کر مفادِ خواص کے استحقاق کو غصب اور استحصالِ بالجبر

نہ قرار دے، اُن طبقوں کی حالت کا سُدھرنا ایک خواب بے تعبیر ہے، جن کی تہذیب اخلاق پر نوعِ انسانی کے تمدّن کا دار و مدار ہے۔ مذہب نے جو سب سے بڑا احسان نوعِ انسانی پر کیا ہے وہ یہی ہے کہ اُس نے ایک خیالی دنیا کا نظام قائم کر کے اس دنیا کی وہ تمام نعمتیں غریبوں کو بخش دی ہیں جو اِس دنیا میں ان کو میسّر نہیں آتیں۔ غالب کا وہ مشہور شعر جسے کوتاہ نظر لوگوں نے اس کی جولانیٔ فکر کا ایک بے عنان اظہار اور اس کے گستاخ تخیّل کا ایک مجنونانہ تصوّر سمجھ رکھا ہے حقیقت میں سوسائٹی کے اسی طبقے کی ایک فریاد ہے جو اِن لفظوں میں شاعر کی زبان سے نکل گئی۔

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اِسی غربا پروری کے باعث مذہب غریبوں کے طبقوں میں امیروں کے طبقوں سے زیادہ مقبول ہے اور یہ مقبولیّت ایک ایسے مبارک اور خوش آیند ردِّ عمل کا موجب ہے، جس کی بدولت غریب طبقوں کے افراد مذہب کے احکام اور قوانین کی اِس لئے بڑی شدّت سے پابندی کرتے ہیں۔

کہ اس فرماں برداری اور پرہیزگاری سے اُن کی عاقبت بخیر ہوگی اور حیاتِ بعدُ الممات میں وہ ان پابندیوں کا انعام پائیں گے جو انہوں نے اپنے اوپر اسی اُمید میں عائد کر رکھی ہیں۔ اگر مذہب ان توقعات کا وسیع خوانِ کرم نہ بچھا دیتا تو سوسائٹی کے اِن افراد کے گناہوں اور جرموں کی فہرست اُس فہرست سے بہت زیادہ طویل ہوتی، جو اب واعظوں اور ناصحوں کی پند و نصائح کا عنوان ہے۔ دولتمند طبقوں میں مذہب کی نسبتاً کم مقبولیت اور مذہبی قوانین کے نسبتاً کم احترام کا بھی یہی راز ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے غریبوں کو جن آسائشوں کی امید دلا کر اس کارزارِ عمل سے زیادہ ایک عشرت کدۂ خیال کا وارفتہ بنا رکھا ہے امیروں اور دولتمندوں کو اسی دنیا میں حاصل ہیں۔ اور مذہب کے بچھائے ہوئے خوانِ کرم پر ایسی کوئی نعمت نظر نہیں آتی جس کو دیکھ کر اِن منعموں کے منہ میں پانی بھر آئے۔ جب انسان کی نفسیاتی کیفیت کی یہ صورت ہو تو اب ناصح اور واعظ کے پاس اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ ان دولتمندوں کو جن کی دولت جنّت بنا سکتی ہے اور حوریں خرید سکتی ہے، عذاب اور سزا سے ڈرائے۔ یہی کام وہ مصنف کرتے ہیں جن کا مقصودِ نظر

سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کی اصلاح ہے۔ اور یہی کام مَیں نے بھی کیا۔ مَیں نے "آرام شاہ کی بیٹی"، "باپ کا گناہ"، "دو عورتیں"، اور "دھن وان"، میں اسی تجزیہ کا ایک مہیب نقشہ کھینچا ہے جو دولتمندوں کی پرورشِ تعیّش سے متکیّف زندگی کا اسی طرح منتہا ہے جس طرح خمارِ صبح نشۂ دوشینہ کا مآل اور سویدائے شام سفیدۂ سحر کا انجام ہے۔ اگرچہ آسکر وائیلڈ اپنی مجلسی کمزوریوں کے باعث انگریزی سوسائٹی میں مقبول نہ ہو سکا۔ مگر اس کی جلاوطنی کے بعد جب انگلستان کی قدامت پرستی کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔ تو انگلستان کی یونیورسٹیوں کے طلبہ محض آسکر وائیلڈ کی تحریر ہی کو نہیں بلکہ اُسے بھی اپنا محبوب و مطلوب سمجھنے لگے۔ محمود علیؒ جب آکسفورڈ سے واپس آئے تو اسی اثر سے متاثر تھے۔ ہم دونوں مل کر "پکچر آف ڈورین گرے"، "ڈی پروفنڈس" اور آسکر وائیلڈ کے ڈرامے پڑھا کرتے تھے۔ اور ان کے چیدہ چیدہ ٹکڑوں کا اُردو میں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ مَیں نے بعد میں سنا کہ محمود علیؒ اپنے والدِ محترم سیّد محمّد علی کے نقشِ قدم پر چل کر حیدرآباد سول سروس میں کسی معزز عہدے پر مامور ہو گئے اور ابوالحسن نے اپنے جدِّ امجد کی تقلید میں کوئی عالی

مرتبت عسکری خدمت اختیار کر لی۔ میں جب نواب معین الدولہ اور نواب ولی الدولہ کی درباداریوں سے گھبرا جاتا تھا۔ تو کبھی ڈیڈی راشفورٹ کے ہاں چلا جاتا تھا۔ کبھی ابوالحسنؑ کے ہاں اور کبھی گولکنڈے میں محمود علیؑ کے ہاں۔

کہتے ہیں دانے دانے پر مہر ہوتی ہے اور جتنا آب و دانہ کسی کے نصیب میں ہوتا ہے اُسے اتنا ہی ملتا ہے۔ حیدر آباد میں میرے لئے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ آسودگی اور خوشی کا کوئی ایسا سامان نہ تھا جو وہاں میسّر نہ آ سکتا ہو۔ سواری کے لئے نواب معین الدولہ بہادر کی رولز رائس تھی۔ رہنے کے لئے خانہ باغ پیلس، بشیر باغ اور نواب ولی الدولہ کا قصر۔ کھانے کے لئے انواع و اقسام کی اتنی نعمتیں کہ اگر انسان اُن میں سے ایک ایک چیز کو چکھے تو پیٹ بھر جائے۔ وقت گزارنے کے لئے بادشاہی صحبتیں۔ مگر طبیعت تھی کہ روز بروز بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ صحت رفتہ رفتہ جواب دے گئی۔ فقیروں کی صحبت میں رہنے والا دِل امیروں کی تمکنت سے گھبرانے لگا۔ انقلاباتِ زمانہ کو دیکھ دیکھ کر نظر جاہ و جلال کی حقیقت پر کچھ شک سا کرنے لگی اور جب میں یہ دیکھتا تھا کہ نعمتوں

کے اُس دور میں میری خوراک صرف چائے کا ایک پیالہ اور ہنٹلی پامر کا ایک بسکٹ رہ گئی ہے۔ ریشم اور قیمتی سرج کے شاندار لباس میری وارڈ روب میں میری تندرستی کے منتظر رہتے ہیں۔ اور میں متاعِ حیات کی ساری عشرتوں کی موجودگی کے باوصف زندگی کی کسی مسرّت سے متمتّع نہیں ہو سکتا تو ایک قاہر وجابر تقدیر کے آہنی خط وخال میری آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ اور وہ سازو سامانِ عیش میرا منہ چڑاتا ہوا دکھائی دینے لگتا۔ اِس پر آلما لطیفی کے الفاظ دن رات میرے کانوں میں گونجتے رہتے۔ "جس شخص کی ساری بساط صرف امرا کی سرپرستی ہو اُس کی اقبال مندی ایک مبہم سی چیز ہے"! آخر ایک دن مستقبل کی ساری امیدوں کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دیا۔ ترقی و اقبال کا جو سنہری خواب دیکھا تھا اسے اپنے ہاتھوں سے پریشان کر دیا۔ عقل کو بے سمجھ کہا۔ دُور اندیشی کو نادانی سمجھا اور دل کی بات مان لی۔ قصروں اور محلوں کی عشرت و آسائش کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر میں ایک دن چپ چاپ حیدر آباد سے چلا آیا۔

درویش را نباشد منزل سرائے سلطان
مائیم و کہنہ دلقے کاتش دراں تواں زد

حیدر آباد میں اسلامی عظمت کے نظارے دیکھ دیکھ کر بار بار دل میں یہ امنگ پیدا ہوئی تھی کہ ہندوستان کی کوئی ایسی ہندو ریاست بھی دیکھنی چاہیئے جہاں ہندِ قدیم اور ہندو تہذیب کی عظمت کے مناظر نظر آسکیں۔ اب جو میں حیدر آباد سے واپس آیا تو اس آرزو کو پورا کرنے کی فکر ہوئی۔ میری نظرِ انتخاب چتوڑ گڑھ اور اُدے پور پر پڑی۔ تاریخِ ہند کے وسیع مطالعے سے مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو چکی تھی کہ ہو نہ ہو اُدے پور کی ریاست میں پراچین بھارت کی مجلسی زندگی کے آثار ضرور مل جائیں گے۔ میرے ایک بہنوئی سیّد اقبال علی شاہ اس زمانے میں ریاست ٹونک میں نیماہیڑہ کے ناظم تھے۔ یہ علاقہ اُجّین اور اُدے پور کے درمیان واقع ہے۔ کچھ دن لاہور میں قیام کرنے کے بعد میں ان کے پاس نیماہیڑے چلا گیا۔ نیماہیڑہ دیکھنے کو تو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ مگر ناظم صاحب کے محل کا بیشتر حصّہ سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ راجپوتانے کی شوکت کے زمانے میں یہ کسی راجپوت راجہ کا راج بھون ہو گا۔ برسات کا موسم یوں تو ہندوستان بھر میں بہت حسین اور نظر فریب ہوتا ہے۔ مگر جو جنوں انگیز اور سحر پرور

کیفیتیں راجپوتانے کی برسات میں ہیں، وہ کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آتیں۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں پر کالے، سفید اور سرخ پتھر برسات کے پانی سے نہا دھو کر کچھ ایسے نکھر جاتے ہیں کہ جس طرف نظر اُٹھاؤ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدرت نے اس سرسبز و شاداب سرزمین پر جگہ جگہ جواہر نگار محل بنا دیئے ہیں اور ان کی منبت کاری میں وہ اہتمام کیا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قصروں اور محلوں میں نظر نہیں آتا۔ بارش کے تھمتے ہی میں اس شاداب سبزہ زار میں سیر کے لئے چلا جاتا تھا۔ جو نیماہیڑے کی فصیل سے باہر کسی پہاڑ کی پُر بہار وادی کی طرح دُور تک چلی گئی تھی۔ نیماہیڑے کا سرکاری ریسٹ ہاؤس ناظم صاحب کے محل سے کوئی تین میل کے فاصلے پر شاہراہ کے قریب ہی واقع تھا۔ ایک دن اتفاق ایسا ہُوا کہ میں جب اس ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچا تو بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لئے میں ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ایسا نظارہ جسے ایسے مقام پر دیکھنے کی توقع کم از کم مجھے کبھی نہ تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر

ایک عجیب الہیئت انسان جلوہ فرما تھے۔ سر کے بال عورتوں کے بالوں کی طرح لمبے، ڈاڑھی گھنی اور فرنچ کٹ، آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی عینک، پیشانی پر شِو کے پجاریوں کی طرح سیندور کی تین لکیریں۔ بدن پر سبز مخمل کا فراک کوٹ اور بادامی کارڈرائی کی برجس۔ پاؤں میں سیاہ پیٹنٹ کا جیک بوٹ۔ ایک ہاتھ میں بند چھتری اور چھڑی۔ دوسرے ہاتھ میں برہنہ تلوار۔ گھٹنوں پہ دونالی بندوق۔ یہ بزرگ عالمِ تنہائی میں اس شان سے بیٹھے تھے کہ انہیں دیکھ کر میرے دل پر دہشت سی طاری ہونے لگی۔ ابھی میری آنکھیں اُن کی ہیئتِ کذائی کے مطالعے سے فارغ نہ ہوئیں تھیں کہ برآمدے کے شمالی کونے سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ معاً میری نظر اس طرف اُٹھ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت حسین و جمیل یورپین نازنین لوہے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایک ستون کے ساتھ بندھی ہے۔ اُس کے لمبے لمبے بھورے بال اُس کے گورے گورے چہرے پر ایسے بل کھا رہے تھے جیسے چاندنی رات میں کبھی کبھی بھورے بھورے بادل چاند کے رُخِ روشن پر غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں۔ اُس کا سکرٹ گھٹنوں تک تھا

اور بلوز بہت باریک ریشم کا تھا۔ شکل و صورت سے اس کی عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نظر نہ آتی تھی۔ غرض جہاں تک دیکھنے کا تعلق تھا۔ وہ ایک خوبصورت، خوش اندام اور نوجوان لڑکی تھی۔ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر میری خیالی دہشت ایک حقیقی خوف میں تبدیل ہو گئی اور وہ سارا منظر میرے لئے ایک معمہّ بن گیا۔ اب میں حیران تھا۔ کہ اِس معمےّ کا حل دریافت کروں تو کس سے کہ وہ جو بزرگ کرسی پر بیٹھے تھے۔ اُن کی آنکھیں آسمان میں گڑی ہوئی تھیں۔ میں دس منٹ سے وہاں موجود تھا۔ مگر انہوں نے نہ آنکھ جھپکی نہ میری طرف توجہ ہی کی۔ اُدھر وہ بیچاری لڑکی زنجیروں میں جکڑی ہوئی فریاد بہ لب تھی۔ آخر کار میں بھی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ کب بارش تھمے اور میں اِس ہولناک ماحول سے رہائی پاؤں۔ اتنے میں اُس عجوبۂ روزگار انسان نے لڑکی کی طرف گردن پھرائی۔ اور ایک مہیب آواز میں کسی کو للکارا "جاتا ہے یا یہیں ڈھیر کر دوں"! یہ کہتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور پینترے بدل بدل کر ننگی تلوار ہوا میں گھمانے لگے۔ تلوار کا ہوا میں گھومنا تھا۔ کہ لڑکی نے بڑے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا "میں جاتا ہوں۔ میں

پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ چھیل شاہ کی دُہائی۔" یہ سُن کہ وہ بزرگ ہنسنے لگے۔ اور بڑی تمکنت سے فرمانے لگے "ہاں بچّہ! اب چھیل شاہ کی دُہائی یاد آئی۔ اگر پھر آیا تو جان کی خیر نہیں۔" اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لڑکی اس طرح کراہنے لگی ہے جس طرح کوئی درد سے بیتاب ہو۔ اور ایسے سِسکیاں بھرنے لگی ہے جیسے کسی کو بہت سخت چوٹ لگی ہو۔ اب وہ بزرگ پھر کرسی پر بیٹھ گئے اور اُس لڑکی کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "میری! اب تم آزاد ہو۔ اب یہ جن تمہیں کبھی نہیں ستائے گا۔" یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جہاں اس بزرگ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ وہیں وہ زنجیریں جن سے وہ لڑکی بندھی تھی۔ خودبخود ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اب میرے خوف کی کوئی حد نہ رہی اور میں یہ سمجھنے لگا کہ میں کسی ایسے شخص کے حضور حاضر ہوں۔ جس کی ہیبت کا سِکّہ اُس دُنیا میں بھی چلتا ہے جو ہم انسانوں کو نظر نہیں آتی۔ اِسے خوف کہیئے یا احترام۔ میں کسی فوری جذبے سے مجبور ہو کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میری جیب میں اُس وقت بیس روپے ہی تھے بڑی عقیدت سے میں نے دس دس روپے کے دو نوٹ اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھے اور اس بزرگ کی طرف

سہم کر بڑھا۔ نوٹ دیکھ کر وہ بزرگ مسکرائے اور فرمانے لگے۔ "تو ہمیں پیسے کا بھوکا سمجھتا ہے۔ کچھ لینا ہے تو ہم سے لے جا۔" یہ کہہ کر ایک تھیلا جو کرسی کے بازو سے لٹک رہا تھا۔ زمین پر اُلٹ دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ کوئی پانچ چھ ہزار کے نوٹ فرش پر بکھر گئے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "گستاخی معاف۔" فرمانے لگے۔ "تم کون ہو" میں نے انہیں ایک صاحبِ کشف بزرگ سمجھ کر دو چار فقیروں میں اپنا مختصر حال سُنا دیا۔ یہ سُن کر کہ میں ناظم صاحب کے ہاں مقیم ہوں۔ کہنے لگے۔ "ناظم صاحب سے کہو۔ ہمیں اِس بنگلے میں ٹھہرنے کی اجازت دیں۔ یہاں کا چوکیدار ہمیں بہت تنگ کرتا ہے اور ہاں ہمارے کھانے کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔ یہاں کوئی باورچی نہیں ملتا۔" اب میں حیران ہو گیا کہ یہ شخص جس کی حکومت کا لوہا جن و پری مانتے ہیں اور جس کے ایک اشارے سے لوہے کی مضبوط زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ چوکیدار کے ہاتھوں اتنا عاجز ہے۔ اور پیٹ کے دھندے سے اتنا لاچار کہ اس کو بھی ناظم صاحب کی امداد کی ضرورت آپڑی ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ ناظم صاحب سے کہہ کر سب انتظام کرا دوں گا۔

بارش تھم گئی تو میں گھر واپس گیا۔ اپنے بہنوئی سے ساری حقیقت بیان کی۔ وہ بھی یہ ماجرا سُن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ بڑے خوش عقیدہ آدمی تھے۔ فوراً منشی کو بلایا اور اسے چھیل شاہ کے قیام اور طعام کے انتظام کے لئے ضروری ہدایات دے دیں۔

دوسرے دن میں اور میرے بہنوئی شاہ صاحب سے ملنے ریسٹ ہاؤس گئے۔ وہاں پہنچے تو ایک اور ہی ہنگامہ بپا دیکھا۔ شاہ صاحب کے ہاتھ میں ایک لمبا سا چابک تھا۔ جیسے وہ سرکس کے رنگ ماسٹروں کی طرح زور زور سے ہوا میں پھٹکار رہے تھے۔ اور ان کے منہ سے مسلسل مگر مختلف زیروبم کے ساتھ "علی با سکا۔ علی یا سکا" کی آواز نکل رہی تھی۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد وہ ریسٹ ہاؤس کے سامنے کے میدان میں اِس طرح دوڑنے لگتے تھے۔ جیسے کسی مفرور کو گھیر گھیر کر لاتے ہیں۔ کل کی طرح انہوں نے آج بھی ہماری طرف دھیان نہ دیا۔ میں نے دو تین مرتبہ کسی قدر بلند آواز سے سلام بھی کیا مگر ان کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ میرے بہنوئی شاہ صاحب کی اِس مجذوبانہ کیفیت کو دیکھ دیکھ کر حیران اور مرعوب ہو

رہے تھے۔ آخر شاہ صاحب چابک کو لپیٹتے ہوئے واپس آئے اور فرمانے لگے "یہ معاش آج خود نہیں آیا۔ اپنی بہن کو بھیج دیا۔ چھیل شاہ کو ایسا ہی اناڑی سمجھ رکھا ہے اس نے، کہ اس کے جھانسے میں آجائے گا۔ علی باسکا کی طاقت نہیں جانتا" میرے بہنوئی اکثر بے سوچے سمجھے بات کر دیا کرتے تھے۔ کہنے لگے "یہ علی باسکا کون حضرت ہیں"؟ شاہ صاحب نے جواب دیا "شاہِ جنّات" مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں پوچھ ہی بیٹھا۔ حضرت یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر ایسے مجذوبوں کی طرح جو عالمِ جذب میں بے ربط سی باتیں کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرمانے لگے "تیرے ساتھ یہ کون ہے۔ علی باسکا شاہِ جنّات کو نہیں جانتا۔ چھیل شاہ کو نہیں پہچانتا"! میں نے عرض کی "یہی میرے بہنوئی ہیں اور اس علاقے کے ناظم۔ پھر ایسے جیسے کسی مست کو ہوش آجاتا ہے۔ شاہ صاحب سنبھل گئے اور فرمانے لگے۔ اچھا! آپ ناظم صاحب ہیں۔ بڑی تکلیف فرمائی۔ شکریہ! ہاں کھانے کی اب کوئی تکلیف نہیں رہی۔ آئیے بیٹھئے۔ میں آپ کو یہ سارا قصہ سناتا ہوں"۔ ہم اُن کے ساتھ بنگلے کے اندر چلے گئے۔ میں نے دیکھا۔ کہ وہی کل والی

"میری" بہت خوبصورت لباس پہنے ایک کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ آج اس پر اور ہی کیفیت تھی۔ نہایت شستہ انگریزی میں ہماری مزاج پرسی کی۔ اور بیٹھنے کو کہا۔ شاہ صاحب نے "میری" کی طرف اشارہ کر کے اس معاملے کی کیفیت سنانی شروع کی۔

"ان کا نام میری رازن کلیئر ہے۔ یہ انگلستان کے ایک بہت بڑے تاجر کی بیٹی ہیں۔ اور بمبئی میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہیں۔ پچھلے سال ان پر ایک جن عاشق ہو گیا۔ اور انہیں دن رات ستانے لگا۔ ان کے ماں باپ نے اسے کوئی بیماری سمجھ کر ہزاروں علاج کئے۔ مگر جن کو نہ جانا تھا نہ گیا۔ یہ جن سمندر کا رہنے والا تھا۔ جب اپنے گھر جاتا۔ تو یہ بیچاری بھی بھاگتی اور چلاتی ہوئیں سمندر کے ساحل کی طرف چلی جاتیں۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ میں بھی سیر کو سمندر کے کنارے کنارے ذرا دور نکل گیا۔ ان کی یہ حالت دیکھی تو مجھے ترس آیا۔ علی یاسکا شاہِ جنات میرے قبضے میں ہے۔ اسے طلب کیا۔ اور ان کا حال پوچھا۔ علی یاسکا نے بتایا کہ ہیرامن سمندر کا جن جو مالا بار کے قریب گرداب میں رہتا ہے۔ اس لڑکی پر عاشق ہو گیا

ہے۔ ہیرامن کی بہن اِس سمندر کی رانی ہے اور مچھلی کے رُوپ میں دن رات سمندر کا چکر کاٹتی رہتی ہے۔ ہیرامن اس سے ڈرتا ہے۔ نہیں تو کب کا اِس لڑکی کو بھگا کر گرداب میں لے جاتا۔" میں نے علی یاسکا سے کہا۔ اِس لڑکی کو ہیرامن کے پنجے سے نجات دلاؤ۔" اُس نے جواب دیا۔ میرا اختیار خشکی کے جنّات پر ہے، تری کے جنّات پر نہیں۔ جب تک یہ لڑکی ساحل سے سوا سو میل دور نہ چلی جائے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں "میری" کے ساتھ اس کے گھر آیا اور یہ سارا ماجرا اُس کے ماں باپ کو کہہ سنایا۔ وہ علاج سے تو مایوس ہو ہی چکے تھے۔ انہوں نے میری بات پر یقین کر لیا۔ اور "میری" کو میرے ساتھ کر دیا۔ میں اِسے اب اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ کل ہیرامن کو تو نکال دیا ہے۔ آج اس کی بہن آئی تھی۔ اُسے بھی علی یاسکا کے حوالے کر دیا ہے۔ امید نہیں اب وہ اِنہیں ستائیں مہینہ سوا مہینہ اور دیکھوں گا۔ اگر ہیرامن اور اس کی بہن باز آ گئے۔ تو اِنہیں بمبئی لے جا کر اِن کے ماں باپ کے سپرد کر دوں گا۔" یہ کہہ کر شاہ صاحب نے پوچھا "آپ سگریٹ پیتے ہیں۔" پھر اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ اُس میں چاندی کا ایک خوب صورت

سگریٹ کیس اور چاندی ہی کی ڈبیا میں دیا سلائی رکھی تھی۔ میرے بہنوئی نے ابھی سگریٹ کیس کھولا ہی تھا کہ انہوں نے پوچھا۔ "پان بھی کھاتے ہیں آپ" یہ کہہ کر بائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ اس میں تازہ لگے ہوئے پانوں سے بھری ہوئی ڈبیا موجود تھی۔ اب بار بار اپنی حیرت کا ذکر کیا کروں۔ میں نے یقین کر لیا۔ کہ چھیل شاہ واقعی ایک صاحب کرامت بزرگ ہیں اور وہ جو کچھ بھی چاہیں، کر سکتے ہیں۔ "میری" نے خود بخود شاہ صاحب کے بیان کی تائید کی اور ہم نے سمجھ لیا کہ جو کچھ شاہ صاحب نے کہا ہے سچ ہے۔ ناظم صاحب نے پان کھایا تو انہیں اُگالدان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چھیل شاہ نے انہیں اِدھر اُدھر گردن پھراتے دیکھا، تو کہا "اُگالدان چاہیئے"۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ایک اُگالدان جو کمرے کے کونے میں رکھا تھا شاہ صاحب کی طرف چلا آ رہا ہے۔ جب اُگالدان شاہ صاحب کے قریب پہنچا تو انہوں نے اُسے ناظم صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ ناظم صاحب بے اختیار چلا اُٹھے۔ یا مظہر العجائب! اب انہوں نے بڑی عقیدت سے شاہ صاحب کو اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی۔ اور یہ بھی کہا "اگر ریسٹ ہاؤس کی جگہ آپ غریب خانے ہی پر قیام فرمائیں تو بڑا احسان ہو گا"۔

شاہ صاحب نے فرمایا "میرا کسی کے مکان میں رہنا اچھّا نہیں۔ دن رات میرے پاس جِنّات کا گذر رہتا ہے"

غرض اب میں سارا سارا دن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ آرزو یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح انہیں خوش کر کے جِنّات کو قابو میں لانے کا ڈھنگ سیکھ لوُں۔ اِس عرصے میں شاہ صاحب کی جو جو کرامتیں میں نے دیکھیں ان کا بیان بہت طویل ہو جائیگا۔ آخرِ کار ایک دن میری تقدیر نے یاوری کی بڑے رازدارانہ انداز سے فرمانے لگے "ہر علم کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اصلی اور ایک نقلی۔ اصل کو کوئی کوئی جانتا ہے۔ البتہ نقل کرنا سب جانتے ہیں۔ دنیا میں جتنے عالم اور فاضل تمہیں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے علم و فضل لباس کی طرح پہن رکھا ہے۔ اِس لباس کو اتار دو۔ تو جہالت کے سوا ان میں اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ میرے علم کے بھی اِسی طرح دو پہلو ہیں جو کچھ میں جانتا ہوں۔ اُسے سیکھنے کے لئے ایک عمر چاہیئے لیکن اب تم اصرار ہی کرتے ہو تو تمہیں اس کی نقل سکھائے دیتا ہوں۔ اصل اور نقل میں تمیز کرنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ دو چار دن کی مشق میں ایسے ہو جاؤ گے کہ

کہ ظاہر بین لوگوں کی نظر میں چھیل شاہ اور تم میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ یہ کہہ کر شاہ صاحب نے باطل کا وہ طلسم خود ہی توڑنا شروع کر دیا۔ یہ باریک بالوں کا ایک لمبا تار بنالو۔ اس کے ایک کنارے پر ذرا سی موم لگا دو۔ جس برتن کے پیندے میں چاہو۔ چپکا دو اور بالوں کے تار کا دوسرا سرا ہاتھ کی ایسی صفائی سے کھینچو کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ برتن خود بخود تمہاری طرف رینگتا چلا آئے گا۔ ہاتھ پہ سیکرین کی تہ جما لو۔ جس چیز کو چھوؤ گے، میٹھی ہو جائے گی۔ انگلی پر پارہ مل لو۔ سونے کو چھوؤ گے، تو چاندی بن جائے گا۔ میں یہ باتیں سُنتا جاتا تھا اور میری آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھتے جاتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ انسان سے زیادہ بیوقوف کوئی حیوان نہیں اور سمجھ رہا تھا کہ شاہ صاحب مجھے اب بھی بیوقوف بنا رہے ہیں۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ شاہ صاحب صبح سویرے ہی کہیں غائب ہو گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے اتنا ضرور بتایا۔ کہ رات کوئی بارہ بجے ایک نامعلوم شخص آیا تھا جس کے ساتھ وہ اور "میری" فجر کی نماز سے پہلے ہی چل دیئے۔

اُسی روز شام کو معلوم ہُوا کہ ریاست کی پولیس چھیل شاہ کی تلاش میں ہے۔ جب پولیس کے انسپکٹر صاحب ناظم صاحب کے پاس آئے تو جو کچھ اُن کی زبانی سنا اُس نے ہمیں پہلے سے بھی زیادہ حیرت میں ڈال دیا۔ اصل قصّہ یہ تھا۔ کہ "میری" کلکتے کی ایک بیہودہ بیسوا تھی اور چھیل شاہ ایک مشہور عیار تھا۔ دونو نے مل کر بمبئی اور راجپوتانے میں مکر و فریب کا ایک وسیع جال پھیلا رکھا تھا۔ ہاتھ کی صفائی اور نظر بندی کے کرتب یہ دونو ایسے جانتے تھے کہ بڑے بڑے نظر باز دھوکے میں آجاتے تھے۔ چھیل شاہ پُرانا سزا یافتہ تھا۔ ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرتا تھا۔ اب بھی ایک مارواڑی سیٹھ کو دھوکا دے کر کوئی بیس ہزار روپے اُڑا لایا تھا۔ اور گرفتاری سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر چُھپتا پھرتا تھا۔ وہ شخص جو رات کو اس کے پاس آیا تھا اُس کے بہت سے مخبروں میں سے ایک تھا۔

استغفر اللہ اِس شخص نے ہم سب کو کتنا دھوکا دیا۔ یہ کیا تھا اور ہم اِسے کیا سمجھے۔ کیا انسان کا ظاہر محض باطل فروشی ہے کیا وہ چیزیں جو ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور وہ نظّارے جن کا رعب ہمارے دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے وہم

اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی انسان کی طاقت اس لئے طاقت نظر آتی ہے کہ اُسے دیکھنے والا کمزور ہوتا ہے۔ کسی شخص کے علم کی فضیلت کا سکّہ اس لئے چلتا ہے کہ اس کو پرکھنے والے جاہل اور نادان ہوتے ہیں۔ انسان، انسان کو اس لئے خدا سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس نے کبھی خدا کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ غرض اسی قسم کے خیالات کا ایک طوفان تھا جو میرے سینے میں اُبلنے لگا۔ اور مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اگر کوئی شخص انسان کو بیوقوف بنانا چاہے تو بیوقوفوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہیں۔ اور یہ سارے گندم نُما جو فروش درویش اور فقیر، سادھو اور جوگی، گرُو اور پیر جو طرح طرح کے روپ دھار کر اور اپنے آپ کو قسم قسم کے لباسوں سے آراستہ کر کے اپنے اپنے مذہب کی صحیح تعلیم اور شریعت کے خلاف نئے نئے ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں محض بہروپئے اور پاکھنڈی ہیں اور جس شخص کا خدا پر ایمان ہو۔ وہ کبھی ان بہروپیوں اور پاکھنڈیوں کی عظمت کا لوہا نہیں مان سکتا۔ وہ لوگ جو کسی انسان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہیں اور اسکی ظاہری یا باطنی طاقت سے ڈرتے ہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اُن کے دل ابھی تک کفر سے رنگے ہوئے ہیں

اور ان کی آنکھوں پہ ابھی تک باطل کے پردے پڑے ہوئے ہیں
اور واقعی جو کچھ چھیل شاہ نے کہا تھا، سچ ہے کہ "دنیا میں جتنے عالم
اور فاضل تمھیں نظر آتے ہیں اُنھوں نے علم وفضل لباس کی طرح
پہن رکھا ہے۔ اس لباس کو اتار دو تو جہالت کے سوا اُن میں
اور کچھ نظر نہ آئیگا"۔ یہ واقعہ میرے لئے عبرت کا ایک ایسا سبق
بن گیا جسے میں آج تک نہیں بھولا۔ میں نے اس دن سے لے کر
آج کے دن تک کبھی کسی ایسے شخص کی روحانی یا باطنی طاقت کا
اعتراف نہیں کیا جس کی ظاہری صورت اور سیرت اللہ اور اس کے
رسولؐ کی شریعت کے مطابق نہ ہو۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر نہ تراشد قلندری داند

میرا ارادہ نیما ہیڑے میں ہفتہ عشرہ قیام کرنے کا تھا۔ مگر
چھیل شاہ کی ابلہ فریبیوں نے مجھے دنیا ومافیہا سے کچھ ایسا غافل
کر دیا کہ میں ایک مہینے سے بھی زیادہ عرصے تک وہیں ٹھہرا
رہا۔ میری یہ بہن جن کے ہاں میں مقیم تھا مجھ سے صرف دو سال
بڑی ہیں۔ بچپن میں ہم دونو ساتھ ساتھ کھیلے، ساتھ ساتھ پڑھتے
لکھتے رہے۔ والدۂ مرحومہ کی وفات کے بعد ہم دونو ایک دوسرے

کی غمگساری اور اپنی چھوٹی بہن کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ وہ بہت خوش تھیں کہ چھیل شاہ کی شاگردی میرے قیام کی طوالت کا بہانہ بن گئی۔ میں بھی وہاں کچھ ایسی بیگانگی محسوس نہ کرتا تھا۔ چھیل شاہ کے غائب ہوتے ہی میں نے اُدے پور جانے کا ارادہ کیا۔ میرے بہنوئی نے مجھے ٹونک کے وکیل صاحب کے نام ایک تعارفی خط دیا۔ میں نے مختصر سا سامانِ سفر باندھا۔ اور اُدے پور روانہ ہو گیا۔ رستے میں چتوڑ گڑھ پڑتا تھا۔ وہیں سے اُدے پور کے لئے گاڑی تبدیل کی جاتی ہے۔ دن بھر میں چتوڑ میں ٹھہرا۔ اور چتوڑ گڑھ کی سیر کرتا رہا۔ آپ نے یہ کہاوت سُنی ہو گی۔

"گڑھ ہے چتوڑ گڑھ اور سب گڑھیاں ہیں"

چتوڑ گڑھ حقیقت میں کوئی قلعہ نہیں۔ بارہ میل کے پھیر میں کچّی مٹی کی ایک بلند اور ضخیم فصیل ہے۔ اِس کے اندر اب ایک قصبہ آباد ہے۔ اور کچھ باولیاں ہیں۔ ان باولیوں کا پانی چتوڑ گڑھ کے رہنے والے بڑے شوق سے پیتے ہیں اور اسے متبرک سمجھتے ہیں۔ یہ علاقہ میواڑ کہلاتا ہے۔ کسی زمانے میں میواڑ راجپوتوں کی عظمت کا مرکز تھا۔ اور چتوڑ ہی اس کا پایۂ حکومت

تھا۔ ۱۳۰۳ء میں علاء الدین خلجی نے اُسے فتح کیا۔ مگر زیادہ دیر تک اِس علاقے کو اپنے زیرِ نگیں نہ رکھ سکا۔ سلاطین دہلی کے زوال کے وقت میواڑ میں رانا کُنبھ کی حکومت تھی۔ رانا کُنبھ کی بہادری کے کارنامے راجپوتوں کے اقبال و جلال کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اُس نے نہ صرف ایک برباد سلطنت کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ بلکہ مالوا کی حکومت کو شکست دے کر اپنی سلطنت کی حدود پہلے سے زیادہ وسیع اور زیادہ مضبوط بنا لیں۔ وہ بلند مینار جو رانا کُنبھ نے اِس فتح کی یادگار میں بنایا، اب تک چتوڑ میں موجود ہے۔ رانا سنگرام جو رانا سانگا کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور رانا پرتاپ جو راجپوتوں کی آن اور ساکھ کا ایک زندہ پیکر تھا۔ اِسی رانا کُنبھ کی اولاد میں سے ہوئے ہیں۔ جب بابر نے پانی پت میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا اور مغلوں کی طاقت ہندوستان کی فضا پر ایک ابرِ محیط کی طرح چھانے لگی تو اسی رانا سانگا نے راجپوتوں کا ایک جرار اور بے شمار لشکر فراہم کیا۔ ہزیمت خوردہ افغانوں کو اپنے ساتھ لیا اور سیکری کے قریب کنواہے کے میدان میں مغلوں کی طاقت سے اُلجھ گیا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۷ء کا

ہے۔ رانا سانگا ایک بے خوف اور جانفروش سپاہی تھا۔ بیسیوں معرکوں میں اپنی بہادری اور بے جگری کا ثبوت دے چکا تھا ایک آنکھ، ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ راجپوتی آن کی نرھر دے دیوی کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ یدھ کی رن بھومی میں اس نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ جب لڑا چھاتی تان کر لڑا۔ اس کے بدن کے اسّی گہرے گھاؤ اس کی سخت جانی اور ہمّت کی فراوانی کے شاہد تھے۔ بابر کے اقبال کا ستارہ راجپوتوں کی بہادری پر غالب آیا۔ رانا سانگا اور اس کے ساتھیوں نے شکست کھائی۔ کچھ دن کے بعد چندیری میں بچے کھچے راجپوت راجے پھر جمع ہو گئے۔ لیکن بابر کا لشکر ایک سیلِ بے پناہ کی طرح بڑھتا چلا گیا۔ اور چندیری کے راجہ میدنی رائے کو اپنے سیلِ فنا میں بہا کر راجپوتوں کے اقتدار کو بھی اس کے ساتھ ہی بہا لے گیا۔

رانا سانگا کے بیٹے اُدے سنگھ نے اِس ہاری ہوئی بازی کو پھر جیتنے کی کوشش کی۔ راجپوتانہ کے بکھرے ہوئے سرداروں کو جمع کیا۔ چتوڑ کا قلعہ نئی بنیادوں پر کھڑا کیا اور اِس پُرانے دارالحکومت میں نئے سرے سے راجپوتوں کی سلطنت کی بِنا ڈال

دی۔ شہنشاہ اکبر اور اکبر سے زیادہ اس کے وفادار راجپوت اس خطرے سے آگاہ ہوگئے۔ اور اس طوفان کی وسعت کا اندازہ کرنے لگے۔ جو ایک چھوٹی سی بدلی کی صورت میں چتوڑ کی فضا پر نمودار ہو رہا تھا۔ اکبر نے صورت حالات کا جائزہ لے کر چتوڑ پر کچھ ایسی عزت اور شدّت سے حملہ کیا کہ اُدے سنگھ چتوڑ گڑھ کو اپنے دو بہادر سرداروں جیمل اور فتّا کے حوالے کر کے دیباری کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلا۔ شیخ مبارک کے دونو نورِ نظر ابوالفیض فیضی اور ابوالفضل جو مغل سیاست اور فارسی ادب کے آسمان پر سورج اور چاند کی طرح چمکے۔ اِسی محاصرے کے دَوران میں اکبر کے حضور باریاب ہوئے۔

دیباری میواڑ کی پہاڑیوں میں ایک چھوٹا سا درّہ ہے۔ اتنا چھوٹا کہ اگر سو دو سو پتھر اُس میں رکھ دیئے جائیں۔ تو بند ہو جائے۔ اور کوئی دریافت نہ کر سکے کہ پہاڑ کی اِس دیوار کے پیچھے بھی ایک دنیا آباد ہے۔ اتنا چھوٹا کہ اگر سو دو سو جانثار بہادر ڈٹ جائیں تو دشمن کا لشکر لاکھ سر ٹکرائے، مگر اُدے پور کی راہ نہ پائے۔ رانا اُدے سنگھ نے اس مقام کی اِسی دشوار گزاری اور جغرافیائی حیثیت کو مدِّ نظر رکھ کر ایک

بہت بڑی جھیل کے کنارے جس کا شمالی جنوبی قطر اٹھارہ میل کے قریب ہے۔ اُدے پور کی بنیاد ڈالی۔ جیمل اور فتا چتوڑ گڑھ کے محاصرے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے مارے گئے۔ اور چتوڑ گڑھ پہ مغلوں کا پرچمِ اقبال لہرانے لگا۔ اکبر نے اِن سنگلاخ اور خم در خم پہاڑیوں میں رانا اُدے سنگھ کا پیچھا کرنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا۔

رانا اُدے سنگھ نے ۱۵۷۲ء میں وفات پائی۔ اور اس کا بہادر اور جانباز بیٹا رانا پرتاپ اُدے پور کے راج سنگھاسن پر بیٹھا۔ پرتاپ کا جذبۂ انتقام سیاسی مصلحتوں کے پردے میں نہ چھپ سکا۔ اکبر نے کئی بار دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ مگر پرتاپ نے ہمیشہ اُسے نفرت سے جھٹک دیا۔ اکبر کے راجپوت حلیفوں اور وفادار راجاؤں نے بہت کوشش کی کہ اُدے پور کی راجدھانی بھی جو اب ہندوستان میں ہندو پت کہلانے لگی تھی، مغلوں کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ مگر پرتاپ کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہ اپنے باپ کا عہد توڑ کر مغل شہنشاہ سے وفاداری کا عہد باندھے۔ آخر اکبر نے پرتاپ کا زورِ بازو توڑنے کے لئے وہی گُر برتا۔ جو دانا ہمیشہ سے برتتے چلے

آئے ہیں اور راجپوتوں کے اس باہوبل کو نربل کرنے کے لئے وہی چال چلی جو بادشاہ اور شہنشاہ ہمیشہ سے چلتے رہے ہیں۔ مان سنگھ راجپوتوں ہی کے ایک بہادر فرزند کو پرتاپ کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا۔ رانا پرتاپ پھر پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُس نے پھر اُدے پور میں ایک آزاد حکومت قائم کر لی۔ اُدے پور کے متعلق یہ تاریخی تفصیل اِس لئے بیان کی گئی ہے۔ کہ ناظرین پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ اُدے پور کی راجدھانی اب تک اُس ہندو تہذیب کی یادگار ہے جس پر اسلامی تمدّن کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور اِس میں اُس زمانے کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔ جو راجپوتوں کی عظمت اور اقتدار کا زمانہ تھا۔

شام کو جب میں اُدے پور پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ ٹونک کے وکیل صاحب جن کے ہاں مجھے قیام کرنا تھا اُدے پور میں موجود نہیں ہیں۔ ایک تو مسافری، دوسرے ایسا علاقہ جو شمالی ہندوستان کے علاقوں سے بہت مختلف تھا اور جس کے رہنے والے مجھے کچھ اجنبی اجنبی سے نظر آتے تھے، اب میں حیران تھا۔ کہ کہاں جاؤں اور کس کے ہاں

ٹھہروں۔ اتنے میں ایک بات سوجھ گئی۔ میں نے ایک بھلے آدمی سے دریافت کیا "یہاں کوئی مسلمان بھی رہتا ہے" اُس نے کہا "بہت" میں نے پوچھا۔ کوئی ایسا گھر بھی ہے جہاں ایک مسافر ٹھہر سکے۔ اُس نے جواب دیا "میرے ساتھ آئیے" میں اُس کے ساتھ ہو لیا۔ رستے میں میرے رفیقِ سفر نے اس کے سوا اور کوئی بات نہ کی "اکوّں کے مکان پہ چلیئے بڑی پال میں رہتے ہیں" "بڑی پال" اس مقام کا نام ہے۔ جہاں اُدے پور کا راج بھون واقع ہے۔ یہ ایک اونچی پہاڑی ہے اور یہی اُدے پور کا سب سے بارونق اور پُر فضا حصّہ ہے۔

ہم اس پہاڑی پر چڑھتے چلے جا رہے تھے اور میں حیران ہو رہا تھا۔ کہ یہ شخص مجھے کہاں لئے جا رہا ہے۔ آخر راج بھون کے قریب پہنچ کر میرے خضرِ راہ نے مجھے بتایا "کہ یہ راج محل ہے" اور پھر اُس کے قریب ہی اشارہ کر کے کہا "یہ اکوّں کا مکان ہے" میں اُس مکان کے دروازے پہ پہنچا۔ تو دیکھا کہ ایک بزرگ چارپائی پر بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں ان کی اپنی وضع قطع تو ہندو راجپوتوں ہی کی سی تھی۔ مگر اُن کے حقّے کی وضع قطع ضرور مسلمانوں کے حقّے جیسی تھی۔ میں سمجھ

گیا۔ کہ ہو نہ ہو یہ بزرگ ضرور مسلمان ہیں۔ میں نے بلند آواز سے "السلام علیکم" کہا۔ انہوں نے بڑے تپاک سے جواب دیا۔ "وعلیکم السلام"۔ مجھے اطمینان ہوا۔ اور میں نے اپنی شانِ ورود بیان کی۔ سنتے ہی وہ بزرگ مدارات اور مہمان نوازی کی تصویر بن گئے۔ تین دن تک میں اُن کے پاس رہا۔ اور اِن تین دنوں کے ایک ایک لمحے میں میرے دل پر یہ حقیقت نقش ہوتی رہی۔ کہ اسلام نے اخوّت کا کچھ ایسا بیج بویا ہے کہ جس سرزمین میں بھی اُگے، پھول پھل لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اُدے پور کو ایک اجنبی سرزمین سمجھ رہا تھا اور اپنے آپ کو غریب الدیار جان کر رات بھر کے بسیرے کے لئے حیران ہو رہا تھا۔ اِس گھر کے رہنے والوں نے تین دن تک میری تواضع میں وہ سرگرمی دکھائی کہ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ اگر میں عمر بھر وہیں پڑا رہوں۔ تو بھی اُن کے لئے بارِ خاطر نہ ہوں گا۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ "اِکّے" عربی زبان کی عسکری اصطلاح "احدی" کا ہندی ترجمہ ہے۔ خلفائے عباسیہ کے عہدِ حکومت میں بادشاہ کے ذاتی محافظ جنہیں آجکل "باڈی گارڈ" کہتے ہیں۔ "احدی" کہلاتے تھے۔ اِن کا کام بس یہی تھا۔ کہ

سوتے جاگتے بادشاہ کی حفاظت کرتے رہیں - اور اپنی جگہ سے نہ ہلیں - امتدادِ زمانہ کے باعث اِس لفظ کے معنی اِس قدر مسخ ہو گئے - کہ اب سُست اور کاہل لوگ "احدی" کہلاتے ہیں - اُدے پور میں بھی " اِکّے " اِسی خدمت پر مامور تھے - اور اِن کے خاندان کے افراد باری باری اُدے پور کے فرمانروا کی حفاظت کے فرائض انجام دیتے تھے - انسان کی نفسیاتی کیفیتیں بھی عجیب ہیں - اُدے پور کے رانا جو مسلمان شہنشاہوں پر اعتبار نہ کر سکے اور اپنے بھائی بندوں کو بھی بیری سمجھتے رہے - مسلمانوں کے اِس خاندان کی وفاداری اور جاں نثاری پر اتنا بھروسہ رکھتے تھے کہ انہیں ہندو پت کا محافظ اور اپنی جان کا رکھشک سمجھنے لگے - اِسی مسلّمہ فرض شناسی کے باعث میرے میزبانوں کا گھرانا اُدے پور میں بہت معزز اور قابلِ احترام متصوّر ہوتا تھا -

اُدے پور میں جو تھوڑے بہت مسلمان میں نے دیکھے ، اُن کے رہنے سہنے کے طریقے ہندو راجپوتوں ہی جیسے تھے کھانے پینے کی چیزوں میں کوئی فرق نہ تھا - وہی کانسی اور پیتل کے برتن - وہی گوشت کے بغیر پکی ہوئی ترکاری - بگھاری

ہوئی دال۔ چھوٹی چھوٹی چپاتیاں اور گھی میں تلی ہوئی کچوریاں۔ دودھ مکھّن اور دہی۔ لباس میں بھی کوئی ایسا اختلاف نہ تھا۔ وُہی نکیلی جوتی اور دھوتی۔ وہی انگرکھا اور کمربند اور وہی پیچدار پگڑی یہ مانا اُدے پور اپنی کوہستانی چار دیواری کے باعث ہندوستان کے باقی حصّوں سے الگ تھلگ ہے۔ لیکن میں سوچتا تھا۔ کہ آخر باہر کے لوگ اُدے پور آتے ہیں اور اُدے پور کے رہنے والے بھی دوسرے شہروں میں جاتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ اُدے پور کے پرانے تمدّن پر بیرونی ممالک کے نئے تمدّن کا اثر نہیں پڑا۔ عورتوں کی حیا اور مردوں کی شرافت کا یہ عالم کہ بہو بیٹیاں رنگین کپڑے اور قیمتی زیور پہن کر باولیوں پر پانی بھرنے جاتی ہیں۔ نہ وہ آنکھ اٹھا کر کسی کو دیکھتی ہیں۔ نہ کوئی نظر بھر کر انہیں دیکھتا ہے۔ غیرت اور حمیّت کا یہ وفور کہ کھجور کا پتہ اِس لئے نہیں توڑتے کہ رانا اُدے سنگھ نے کسی زمانے میں ایک کھجور کے درخت کے نیچے پناہ لی تھی۔ راج بھگتی ایسی بے مثال کہ دھوپ ہو یا بارش۔ سر پر چھتری اِس لئے نہیں لگاتے۔ کہ اُدے پور کے مہاراج چھترپتی کہلاتے ہیں اور چھتر لگانا صرف اُنہیں کو سجتا ہے۔ ادب آداب کی یہ حالت کہ

بڑی پال کے اُس حصّے میں جہاں راج بھون ہے۔ جوتی بہن
کہ اس لئے نہیں جانتے کہ وہاں ہندوپت اور بھگوان کا اوتار
براجمان ہے۔
سب لوگ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھاٹ یا لکڑی
کے تخت پر بیٹھتے ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہیں۔ ایک ہی
سا لباس پہنتے ہیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ امیر ہوں یا غریب
کمر سے تلوار لٹکاتے ہیں اور پیٹھ پر ڈھال باندھتے ہیں۔ باہر کا
کوئی شخص آئے تو اس سے غلط سلط اردو میں مگر ہندو ہوں یا
مسلمان آپس میں اپنی ہی بولی میں بات چیت کرتے ہیں۔ میں
تین دن اُدے پور میں رہا۔ لیکن میں نے اِس عرصے میں کسی کے
منہ سے انگریزی کا ایک فقرہ نہیں سنا۔ کسی کو مغربی وضع قطع کا
لباس پہنے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے۔ کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں
اور انگریزوں کی حکومتیں قائم نہ ہوتیں اور ہندوؤں ہی کا راج
رہتا تو ہندوستان کی مجلسی زندگی اِس زمانے میں کچھ ایسی ہی ہوتی
جیسی میں نے اُدے پور میں دیکھی، میں دل ہی دل میں اُدے پور
کا مقابلہ حیدر آباد سے کرتا تھا کہاں حیدر آباد کے تکلّفات اور
کہاں اُدے پور کی تصنّع اور تکلّف سے آزاد معاشرت مگر اس کے

یہ معنی نہیں۔ کہ اُودے پور میں شان و شوکت کی کچھ کمی تھی مطلب فقط یہ ہے کہ اُس کے ساز و سامان میں کوئی چیز بھی بیگانہ اور اُوپری نظر نہیں آتی تھی۔ بیگانہ اور اُوپری بھی سچ پوچھیئے تو اضافی اِصطلاحات ہی ہیں۔ میں تو ہندوستان کے مختلف حِصّوں کے تمدّن اور ہندوستان کی کثیرُ التعداد اقوام کی معاشرت کو دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا انگریز سب نے ہندوستان کو اپنی اپنی تہذیب اور اپنے اپنے تمدّن سے آراستہ کیا ہے۔ اور سبھی نے اپنے اپنے آبائی وطن کے بناؤ سنگار سے اس سرزمین کو چار چاند لگائے ہیں۔ اور ہم یہ جو سنتے چلے آئے ہیں۔ کہ ہندوستان پر ہمیشہ غیر قوموں کی حکومت رہی ہے۔ کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ اِس ملک میں جو غیر بھی آیا، اپنا بن گیا۔ وہ جو کچھ بھی اپنے ساتھ لایا، اُسے اُس نے اپنے نئے وطن کے قدموں میں نذر کر دیا۔ اِس سرزمین کے پانی میں ایسی مٹھاس ہے کہ سب اپنا وطن چھوڑ کر اِسی کی خاک کو اکسیر سمجھ بیٹھے۔ اور اپنے گھر بار کی محبت بھلا کر اِسی میں رہنے سہنے لگے۔ یہ غیر لوگ اگر ہندوستان میں نہ آتے۔ تو یہ سرزمین کیسی کیسی چیزوں سے محروم رہ جاتی۔ اجنتا اور ایلورا کے مندر، قطب مینار

لال قلعہ، تاج محل اور سکندرا اور پھر موہن جو داڑو ٹیکسلا اور فتح پور سیکری کے کھنڈر اپنی اپنی زبانِ حال سے آج بھی انہیں غیر لوگوں کے لطف و کرم کی داستان سنا رہے ہیں. لیکن اِس کو کیا کیجئے کہ فاتح قوموں کے اقتدار کی بنیاد ہمیشہ مفتوح قوموں کے اقتدار کے کھنڈر میں رکھی جاتی ہے۔ اور انسان کے سینے میں نفرت کا بیج جب ایک مرتبہ پھول پھل لے آتا ہے۔ تو اس کا زہریلا پودا صدیوں تک بار آور رہتا ہے اور اپنے کڑوے پھل سے قوموں کی زندگی کو تلخ بنائے رکھتا ہے۔ اب ان لوگوں کو کوئی اپنا سمجھے یا بیگانہ۔ مگر اِنہیں اغیار کی بدولت ہندوستان آج جنّت نشان کہلاتا ہے۔ اگر ہم اُن تمام چیزوں کو اُن کے صحیح تناسب میں دیکھیں۔ جن پر ہندوستان کی موجودہ عظمت کا دارو مدار ہے تو ہم پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اس سرزمین کے سب باشندوں نے اس کی خدمت کی ہے۔ اسے خونِ جگر سے سینچا ہے اور اس کی عظمت کے گیت گائے ہیں. حکومت اور چیز ہے، یہ خدا کی دین ہے وہ جسے چاہے دے اور جس سے چاہے لے لے. جس قوم کی سیرت اُسے حکومت کے شایاں نظر آتی ہے وہ اپنے ملک کی حکومت اُسے دے

دیتا ہے اور جس قوم میں حکومت کی صلاحیت باقی نہیں رہتی وہ اُس سے اپنے ملک کی حکومت چھین لیتا ہے۔ جب ہندو حکومت کے قابل تھے حکومت ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ جب مسلمان حکومت کے قابل نظر آئے، تو یہ اُن کے گھر کی کنیز بن گئی۔ اور جب یہ دونو حکومت کے قابل نہ رہے۔ تو خدا نے ان دونوں کی گوشمالی کے لئے ہندوستان کی سرزمین میں مغرب سے ایک ایسی قوم لا بسائی۔ جس میں اُسے حکومت کی استعداد اور ظلم کی بیخ کنی کی صلاحیت نظر آئی۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہ

اُدے پور سے میں تیا ہیڑے واپس گیا اور وہاں سے اجمیر شریف حاضر ہوا۔ اب کے سید محمد ابراہیم صاحب کی کرمفرمائی کی بدولت جو میرے خاندان کے وکیل تھے مجھے آستانۂ مبارک کے ایک حجرے میں رہنے کی سعادت نصیب ہو گئی۔ حضرتِ خواجہ غریب نواز علیہ الرحمتہ کے آستانۂ مبارک کے صاحبزادوں کو وکیل کہتے ہیں۔ تمام زائر جو خواجہ بزرگ کی درگاہ پر حاضر ہونے

ہیں۔ کسی نہ کسی وکیل ہی کی وساطت سے عتبۂ عالیہ پر باریاب ہوتے ہیں۔ اِن حضرات کے پاس اپنے اپنے مُوکلوں کی فہرستیں موجود رہتی ہیں جو صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ اِن کی دُرستی اور کاٹ چھانٹ بڑے اہتمام سے ہوتی رہتی ہے۔ یہ حضرات اپنے مُوکّل کو کسی دوسرے وکیل کی وساطت سے آستانہ مبارک پر حاضر ہونے نہیں دیتے۔ بسا اوقات مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کسی عقیدت مند خاندان کا کوئی فرد ایک مرتبہ اِن میں سے کسی بزرگ کا مُوکِل بن گیا تو پھر اُس خاندان کا کوئی فرد کسی دوسرے صاحبزادے کا مُوکّل نہیں بن سکتا۔ اِس انتظام میں ایک خوبی یہ ہے۔ کہ زائر کو اقامت اور آستانہ مبارک کی حاضری کے سلسلے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ مگر ان حضرات کی وکالت زائروں کو اُس یکسوئی اور سکونِ قلب سے محروم کر دیتی ہے۔ جس کی تلاش میں عاشقانِ صادق کوسوں کی منزلیں طے کر کے خواجہؒ کی نگری میں آتے ہیں۔

اِس مرتبہ مَیں چھ سات دن تک حضورؒ کے آستانہ مبارک پہ حاضر رہا۔ اور دن رات کے مراقبے سے اکتسابِ سعادت کرتا رہا۔ طبیعت تعلیم و تعلّم کی کاوشوں سے تھک چکی تھی۔

امرا کی دربارداریوں سے بیزار ہو چکی تھی اور اب آرام و سکون کے لئے ایک گوشۂ عافیت کی طلبگار تھی۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ خواجہؒ کی چوکھٹ ہی پر پڑا رہوں۔ لیکن میں وطن سے بہت دُور تھا اور اپنے قیام کو مہماں نوازی کا بار بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اجمیر شریف کے دوسری جگہ جہاں یہ آرام و سکون میسّر آ سکتا تھا، پاکپٹن شریف تھی مقصود کی وحدت سے غرض ہے منزل اور مقام کوئی بھی ہو۔

مکاں کنہ بہرِ حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

اجمیر شریف سے رخصت ہو کر میں کچھ دن لاہور ٹھہرا۔ اور پھر اپنے اُسی مقصدِ وحید کو مدِّنظر رکھ کر پاکپٹن شریف روانہ ہو گیا۔ دیوان صاحب نے انہیں دنوں میں آستانۂ مبارک کے سامنے ایک نئی کوٹھی بنائی تھی۔ اُس کی نچلی منزل میں وہ خود رہتے تھے۔ مجھے دیکھا تو انہوں نے اِسی کوٹھی کی بالائی منزل میں میرے قیام کا بندوبست فرما دیا۔ پاکپٹن شریف ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ اِس لئے اُس کی سطح ناہموار ہے۔ اور اس کی گلیاں پہاڑی پگڈنڈیوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر جاتی ہیں۔ میری اقامت گاہ کا رستہ اور دروازہ بھی الگ تھا۔

میں نے اسی جگہ کو گوشۂ عافیت سمجھا اور اس میں رہنے لگا۔ عشا کی نماز کے وقت سے فجر کی نماز کے وقت تک میں آستانۂ مبارک پر حاضر رہتا تھا اور دن کو اپنے حجرے میں بیٹھ کر روضۂ مبارک کی زیارت سے دل اور آنکھوں کی پیاس بجھاتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد خیال آیا کہ یہ خاموش اور پُرسکون زندگی اُن درویشوں ہی کو زیبا ہے جنہوں نے صرف اللہ سے لَو لگا رکھی ہو اور دنیا کے تمام علائق سے قطع تعلق کر لیا ہو۔ وہ شخص جسے دنیا میں رہ کر دنیا کا کچھ کام کرنا ہے خلوت نشینی اور عزلت گزینی کے مقامات کو اپنے منتہٰی کی منزلیں تو بنا سکتا ہے مگر انہیں منزلِ مقصود نہیں سمجھ سکتا اور جو خرقہ ایک سچّے تارکُ الدنیا کو سجتا ہے وہ ایک دنیادار کے بدن پر مانگے ہوئے لباس یا بہروپ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حقیقت بھی اُسی غور و فکر کے باعث مجھ پر روشن ہوئی جو اُس عالمِ خلوت میں میری دن رات کی مصروفیت تھی۔ آخرِ کار میں نے فیصلہ کیا کہ اگر مجھے حضرت گنج شکرؒ کے آستانۂ مبارک پر حاضر ہی رہنا ہے تو کوئی ایسا کام کیوں نہ کروں جس سے میری حاضری میرے لئے وسیلۂ سعادت

ہونے کے ساتھ ساتھ خلقِ خدا کے لئے بھی موجبِ خیر و برکت بن جائے۔

آستانۂ مبارک میں ایک پرانی وضع کا مدرسہ تھا جس میں قرآنِ مجید کے درس کے علاوہ بچوں کو پرائمری تک کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ اُنہیں ایّام میں دیوان صاحب کے عقیدتمندوں میں سے چند بزرگ کوشش کر رہے تھے کہ اِس مدرسے کی تنظیم انگریزی مدارس کے دستور العمل کے مطابق ہو جائے اور اس کا نام فریدیہ اسکول رکھ دیا جائے۔ اِن میں حضرت سیّد بدر دیوان رحمۃ اللہ علیہ کے خادم سیّد نادر شاہ۔ میاں خیر محمدؐ۔ شیخ محمدؐ صدیق زرگر اور "مانیکے" راجپوتوں کے نامور خاندان کے چند سربرآوردہ افراد میاں محمدؐ یار خاں، خان بہادر میاں نور احمدؐ خاں، میاں نور صمد خاں، میاں نذر محمدؐ خاں اور دیوان صاحب کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ غلام رسُول پیش پیش تھے۔ مَیں نے اِس مدرسے کی تشکیل اور تنظیم کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فریدیہ ہائی اسکول کی بنیاد ڈال دی۔

آستانۂ مبارک کے احترام کو مدِ نظر رکھ کر اسکول تونسوی حضرات کے ڈیرے میں منتقل کر دیا۔ اِس ڈیرے کی عمارت

اگرچہ زیادہ تر کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ تاہم اس کے کمرے کُشادہ اور اس کے دالان وسیع تھے۔ فرنیچر کے لئے سرمایہ کافی نہ تھا۔ کچھ ٹاٹ اور دریاں، کچھ میزیں اور کرسیاں اِدھر اُدھر سے جمع کر لیں۔ بینچ اور بلیک بورڈ بنوائے۔ اور اُس ناکافی سرمائے سے محض وہی سامان خریدا جس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ پرائمری کی جماعتوں کو دالانوں میں بٹھایا۔ اور مڈل اور ہائی کی جماعتوں کے لئے کمرے مقرر کر دیئے۔ میرا دفتر ایک درخت کے نیچے تھا۔ اور ایک لکڑی کی کرسی اور چھوٹی سی میز اُس دفتر کا سازو سامان تھی۔ پرائمری کے استاد تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ مڈل اور انٹرنس کی جماعتوں کو پڑھانے کے لئے مَیں نے اپنے چند ایسے دوست جمع کر لئے جو اب فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کا انتظار کر رہے تھے۔ فارسی اور عربی پڑھانے کے لئے مَیں نے اپنے ایک پرانے اور بہت ہی عزیز دوست مولانا اسد اللہ گیلانی حسن کو گولڑے شریف سے بلایا۔ مولوی اسد اللہ حضرت پیر مہر علی شاہؒ کے ارشدِ تلامذہ میں سے ہیں۔ اِن کے علم و فضل کی سرشاری کا اُس زمانے میں یہ عالم تھا کہ علم و فضل کے ہر دعویدار سے اُلجھ جاتے تھے۔

اور جب تک اسے اپنی دلائل سے قائل نہ کر لیتے تھے اُنہیں چین نہ آتا تھا۔ میں بچپن میں خود بھی اُن سے عربی زبان کی صرف و نحو پڑھ چکا تھا۔ مجھے اِن کے علم و فضل کے تبحّر اور ان کی سیرت کی خوبیوں پر اتنا اعتماد تھا کہ میری نظرِ انتخاب اُنہیں پہ پڑی میں چاہتا تھا کہ فریدیہؒ ہائی اسکول کے طلبہ فارسی اور عربی کی قابلیّت میں دوسرے مدارس کے طلبہ سے ممتاز نظر آئیں۔ اور مشرقی علوم کی تعلیم کا اثر ان کی طبیعت پر ایسا ہو کہ اُن کی صورت درویشانہ اور سیرت شاہانہ بن جائے۔ ظاہر ہے کہ اِس مقصد کے لئے ایسے استاد کی ضرورت تھی جس نے کسی مردِ حق کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے اس کی زبانِ فیض ترجمان سے اکتسابِ علم و فضل کیا ہو۔ حضرت پیر مہرؒ علی شاہ سے زیادہ علمِ شریعت کا عالم اور فنونِ ادب کا ماہر نہ اُس زمانے میں کوئی نظر آتا تھا نہ اِس زمانے میں کوئی نظر آتا ہے۔ علم و فضل میں بزرگی کے باوصف ان کی منکسر مزاجی اور جاہ و جلال کی فراوانی کے باوجود اُن کی درویشانہ زندگی ایسی مقناطیسی کشش رکھتی تھیں کہ جس شخص کو اُن کی صحبت کا فیض نصیب ہوا وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مولوی اسد اللہ برسوں تک اس

درویشِ کامل کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر اپنی سیرت کو شریعت اور طریقت کے زیوروں سے آراستہ کر چکے تھے۔ اِس لئے اُس مقصد کے حصول کے لئے جو میرے پیشِ نظر تھا مجھے اُن سے بہتر کوئی اور شخص نظر نہ آیا۔ جب اُن سے مشاہرے کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو فرمانے لگے "گنج شکر رح کے آستانہ مبارک میں ایک حجرہ اور صبح و شام بابا کے لنگر کی دو روٹیاں"۔ اللہ اللہ! یہ کیسے اُستاد تھے کہ تعلیم و تدریس ہی کو اپنی زندگی کا مآل سمجھتے تھے۔ نہ اُن کی زندگی اُن کو وبال تھی نہ وہ خود کسی کی جان کا وبال تھے۔ علم کی وراثت کو ایک مقدس امانت کی طرح محفوظ رکھتے تھے۔ جب اِس وراثت کا کوئی اہل مل جاتا تھا۔ اُسے اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ نہ اِن لوگوں نے یہ وراثت قیمت دے کر خریدی نہ اُسے قیمت لے کر بیچا۔ یہ وہی استاد ہیں جن کی شاگردی پہ شاگرد فخر کیا کرتے تھے اور جن کے تلامذہ خود صاحبانِ فضل و کمال ہونے کے باوصف ان کا نام ادب اور احترام سے لیا کرتے تھے۔ اور پھر اِس ظاہری شان و شوکت کے فقدان سے یہ بھی نہ تھا کہ شاگردوں پہ ان کا رعب و داب نہ رہے یا مجلسی زندگی میں اُن کا اثر اور رسوخ نہ ہو۔ اِن کے

حلقۂ درس میں شاگردوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ اور جس طرف کو بھی یہ لوگ نکل جاتے تھے بڑے بڑے گردن فرازوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ نہ یہ درویش کسی کے دروازے پر جا کر عزت کی بھیک مانگتے تھے۔ نہ یہ فقیر دولت اور ترقیٔ جاہ کے لئے دن رات مارے مارے پھرتے تھے۔ نہ یہ عالم اپنے علم وفضل کی دکان سجاتے تھے۔ نہ یہ اُستاد اپنی لیاقت اور قابلیت کے ڈھول بجاتے تھے۔ امیر ہو یا غریب، ہندو ہو یا مسلمان، چھوٹا ہو یا بڑا۔ جس میں بھی طلبِ صادق دیکھتے۔ اُسی کو اپنا عزیز سمجھتے اور اپنے علم و فضل کی ساری پونجی اس کے حوالے کر دیتے۔ مولوی اسد اللہ بعد ازاں کوئی دس برس تک لاہور میں میرے ہی پاس رہے۔ پھر تبلیغ کے سلسلے میں ہندوستان کے دور دراز مقامات میں پھرتے رہے۔ اب شہنشاہِ عالمگیر کی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہیں۔ زیادہ تر خاموش رہتے ہیں۔ جب کبھی اُن سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو پہلے نظر بھر کر دیکھتے ہیں۔ پھر مسکرا کر چل دیتے ہیں۔ مَیں نہیں جانتا یہ جذب کی کوئی منزل ہے یا حیرت کا کوئی مقام۔ یا ایسا ہے کہ علم بڑھتے بڑھتے اپنی لاعلمی سے آگاہ ہو گیا۔ یا عقل نے راز کے سمندر میں کوئی

ایسا غوطہ لگایا کہ پھر نہ اُبھری۔

اُس زمانے میں راجہ سر ہری کشن کول منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر تھے اور خان بہادر ملک زمان مہدی صیغہ مال کے افسر۔ سودرے کے قاضیوں کے مشہور خاندان کے ایک نامور رُکن ڈپٹی علاءُالدین بھی اُس وقت منٹگمری ہی میں متعیّن تھے۔ فریدیہ ہائی اسکول کے قیام کے سلسلے میں اِن بیدار مغز، فرض شناس اور رفاہِ عامہ کے شیدائی افسروں سے مجھے بہت امداد ملی۔ راجہ صاحب کی سفارش پر سر رشتۂ تعلیم نے فریدیہ اسکول کو مڈل تک کی جماعتوں کے لئے گرانٹ دیدی۔ اور ملک صاحب اور قاضی صاحب کی کوششوں نے اِسے منٹگمری کے زمینداروں کی توجّہ کا مرکز بنا دیا۔ چھ ہی مہینے کے عرصے میں فریدیہ اسکول کی تعلیمی ترقی دوسرے اسکولوں کے لئے قابلِ رشک ہو گئی اور ہماری کوششوں کے نتائج ایسے شاندار نکلے کہ محکمہ تعلیم کے حکّام بھی حیران رہ گئے۔ مگر پاک پٹن شریف میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کو فریدیہ اسکول کی یہ ترقی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جن کو انگریزی تعلیم کی یہ نئی رسم پسند نہ تھی۔ سب سے بڑی مشکل جو اب اِس اسکول کی ترقی کے رستے میں

مجھے نظر آئی وہ یہ تھی کہ غریب کسانوں، مزدوروں اور دکانداروں کے بچے جو اِس مدرسے میں پڑھتے تھے اپنے کاروبار سے معطّل ہو گئے۔ ان کے ماں باپ میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ اِن بظاہر بیکار بچّوں کا پیٹ پال لیں۔ کتابوں اور دوسرے سامانِ تعلیم کی قیمت تو ایک ایسا بار تھی جسے اُٹھانے کے لئے اُس زمانے میں اِن غریب لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اِس کی وجہ ایک تو یہ تھی۔ کہ اِن لوگوں کی اقتصادی حالت ایسی تھی کہ زندگی کے ابتدائی اور لازمی اخراجات کے سوا اور کسی صرف کی کفیل نہ ہو سکتی تھی اور دوسری یہ کہ لوگ تعلیم کی اہمیّت اور ضرورت سے واقف نہ تھے۔ اور اگر کچھ جانتے تھے تو بس اِتنا کہ مدرسے میں جا کر اُن کے بچّے فی الحال اُن کے کام کے نہیں رہتے اور پڑھ لکھ کر اُس کام کے قابل نہیں ہوتے جو اُن کے آباؤ اجداد کا پیشہ ہے۔ مَیں اُس وقت بھی اِس نتیجے پر پہنچا تھا اور آج بھی میری یہی رائے ہے کہ دیہاتی علاقوں کے مدرسوں کا نصابِ تعلیم اور طریقِ کار ایسا ہونا چاہیئے کہ دیہاتی بچّے صبح و شام مدرسوں میں مروّجہ علوم و فنون کی تعلیم حاصل کر سکیں اور اُن کے دن کا بیشتر

حصّہ اپنے کھیتوں اور اپنی دُکانوں میں بسر ہو۔ صرف اسی صورت میں یہ بچّے اپنے اُن غریب ماں باپ پر بار نہیں ہو سکتے جو نوکر چاکر رکھنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ اور جنہیں ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے ہی بچّوں کی ضرورت ہے۔ غرض ایسی تعلیم جو غریب کسانوں کے بچّوں کو محض پڑھنا لکھنا سِکھا دے۔ دیہات کے لئے کار آمد نہیں اور مدرسوں میں تعلیم کے ایسے اوقات جو دیہاتی بچّوں کو اُن کے گھر کے کام کاج کی انجام دہی سے باز رکھیں، دیہاتی مدرسوں کے لئے ناموزوں ہیں۔ آبائی پیشوں کے فن سے بچّوں کی ناواقفیت اور چھ سات برس تک کے لئے ان کا عملی تعطّل ایک ایسی قیمت ہے جسے دیہات کے کسان اور دکاندار تعلیم جیسی بیش بہا چیز کے لئے بھی ادا نہیں کر سکتے اور یہ خیال کہ زراعت کا فن آلاتِ کشاورزی کی تصویریں دیکھ کر آسکتا ہے اور صنعت و حرفت کتابوں سے سیکھی جا سکتی ہے۔ میری سمجھ میں حقیقت سے اُسی قدر بعید ہے جس قدر علم، عمل سے اور مشاہدہ، تجربے سے۔ کھیتی زمین کی چھاتی پر ہل چلانے ہی سے سونا اُگلتی ہے اور لوہا لوہار کے ہتھوڑے ہی سے کُٹ کر قیمت پاتا ہے۔

فریدیہ اسکول ابتدا میں اُسی طرح جلدی جلدی ترقی کی منازل طے کر گیا۔ جس طرح ہر نیا پودا بڑھتا ہے اور اُسی طرح بہ سُرعت لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا، جس طرح ہر نئی چیز جاذبِ نظر ہو جایا کرتی ہے۔ مگر پاکپتن شریف کے قرب و جوار کے لوگوں کا جوش زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ اور اسکول کے طلبہ کی تعداد کم ہونے لگی۔ اِس کا سب سے بڑا باعث تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں کہ مدرسے کا وقت اور اس کا نصابِ تعلیم غریب کِسانوں اور دکانداروں کے بچّوں کے لئے موزوں نہ تھا۔ اور ہمارے طلبہ کے ماں باپ کی اقتصادی بدحالی اُن کی تعلیم کے اخراجات کی کفیل نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اِس کے علاوہ ہمارے مدرسے کی ترقیٔ معکوس کے دو ایک سبب اور بھی تھے۔ ایک تو یہ کہ ملک زمان مہدی اور قاضی علاءُ الدین منٹگمری سے تبدیل ہو گئے اور فریدیہ اسکول اس سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گیا جو منٹگمری کے زمینداروں کی توجہ اُس کی طرف منعطف کرنے کی بالواسطہ ضامن تھی۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ اگر حکومت کے افسر چاہیں تو اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے علاوہ رعایا کی بہبود کے لئے بہت کچھ کام

کر سکتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اُس علاقے کے وہ امیر زمیندار جو پاکپتن شریف سے فاصلے پر رہتے تھے، اپنے بچّوں کو اپنی نظر سے دور نہ رکھنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ انہوں نے ان کی تعلیم کا انتظام اپنے دیہات ہی میں کر رکھا تھا، اِس لئے انہیں اِس بات کی پروانہ تھی کہ وہ مدرسہ بھی جاری رہے یا نہ رہے جہاں غریب کسانوں اور مزدوروں کے بچّے تعلیم پاتے ہیں۔ اُن موانع کا جو ہمارے اسکول کی ترقی کی راہ میں حائل ہوئے ایک اور پہلو بھی تھا۔ آستانۂ مبارک کے درویشوں اور پرانے عقیدت مندوں کے تعصّب کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ایک ایسے مدرسے میں جو حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر رحؒ کے مقدس نام سے منسوب ہو صرف اُسی قسم کے درس و تدریس کا سلسلہ چاہتے تھے جو عام طور پر مسجدوں اور خانقاہوں میں ہوتا ہے۔ اِدھر میرے احساس کا یہ عالم تھا۔ کہ مَیں یہ بات برداشت نہ کر سکتا تھا کہ دیہات کے رہنے والے جو صدیوں سے ایک ہی لکیر کے فقیر رہے ہیں، موجودہ زمانے کے تغیّرات کی برکات سے محروم رہیں۔ اور ترقی و تہذیب کے وہ دروازے جو شہروں میں رہنے

والوں پر کھل چکے ہیں، دیہات کی آبادی پر ہمیشہ بند رہیں۔
میں دل سے چاہتا تھا کہ فریدیہ اسکول کے طلبہ کی زندگی پر
اسلامی رنگ غالب رہے اور مشرقی علوم و فنون کے وہ سوتے
جو امتدادِ زمانہ اور مسلمانوں کی غفلت سے سوکھ چکے ہیں، از سرِنو
کچھ ایسی روانی سے جاری ہو جائیں کہ محض فریدیہ اسکول ہی نہیں
بلکہ ہندوستان کے سارے اسلامی مدارس اُن کے فیض سے
سیراب ہو سکیں۔ مگر میرا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ انسان ترقی
کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور ترقی کا جذبہ، ایک ایسا جذبہ ہے
جسے کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ اگر کچھ ہوتا ہے تو بس یہی کہ
جب دریا اپنے کناروں کے اندر محدود نہیں رہ سکتا تو اُنہیں
ڈھا دیتا ہے اور اگر فطرت کے اُبھار کو دبایا جائے تو نظامِ
اخلاق درہم برہم ہو جاتا ہے۔

غرض اس وقت میرا نظریّہ یہ تھا۔ کہ وہ نوجوان جو زمانۂ حاضرہ
میں پُرانی تہذیبوں کے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔
اپنی ذات اور اپنے وطن کے لئے ویسے ہی بے سُود ہیں
جیسے وہ لوگ جو نئی تہذیب پر فریفتہ ہو کر اپنی قومی ثقافت اور
اپنے ملکی شرف کی قدر و قیمت نہیں جانتے۔ دکن کے ڈھیڑوں

اور راجپوتانے کے غریب طبقے کے مسلمانوں کو دیکھ کر میں اس نتیجے پہ پہنچ چکا تھا کہ ہندوستان کے جن اصلی باشندوں نے ہندو تہذیب کے اثرات قبول نہیں کئے، اُن کی معاشرت آج بھی ویسی ہے جیسی اُس زمانے میں تھی، جب آریہ نسل کے لوگ ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدّن کو اپنے جلو میں لئے وسطی ایشیا کے میدانوں سے گزر کر ہندوستان میں آ نکلے تھے۔ اور ہندوستان کے نو مُسلموں کے اُن قبیلوں کی معاشرت جنہوں نے اِسلامی تہذیب کے اثرات قبول نہیں کئے، آج بھی ویسی ہے جیسی اُس وقت تھی، جب اِسلام ثقافت و شرف کے نئے معیاروں کا پرچم لہراتا ہوا ہندوستان کی فضا پہ نمودار ہوا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان کے باشندے اپنی تہذیب کی امتیازی خصوصیات کو کسی قسم کا صدمہ پہنچائے بغیر، مغربی تہذیب کے نئے نظریوں سے متاثر نہیں ہوں گے۔ اور مغربی معاشرت کے نئے معیاروں کو ہندوستانی سانچے میں نہ ڈھال لیں گے تو نوعِ انسانی کے وہ افراد جو محض مکانی اِتفاقات اور زمانی حوادث کے باعث ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں تہذیب و تمدّن کی اُن ترقیوں سے یکسر محروم رہ

جائیں گے، جو نوعِ انسانی کے اُن افراد کے فکر و عمل کی سرگرمیوں کی بدولت بر روئے کار آئی ہیں، جو محض مکانی اتفاقات اور زمانی حوادث کی وجہ سے ممالکِ غرب میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ رسمی مغائرت جو نوعِ انسانی کے افراد میں مکانی اور زمانی بنا پر پیدا ہو جاتی ہے اور جس کے باعث ایک مُلک کے باشندے دوسرے ملکوں کے باشندوں کو بیگانہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور وہ روائتی منافرت جو جغرافیائی حُدود کے تعیّنات کے باعث مختلف اقطاعِ عالم کے رہنے والوں کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف جاگزیں ہو جاتی ہے اور جس کے باعث آدم اور حوّا کی اولاد ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے لگ جاتی ہے۔ نہ تو انسان کی آبائی وراثت ہے نہ اس کا فطری اِستحقاق۔ اگر زمانہ حاضرہ کے ہندوستانی زمانۂ قدیم کی تہذیب کی طرف رجعتِ قہقری کر جائیں۔ تو اِس کے معنی اِس کے سِوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہندوستان اُن ترقیوں سے محروم ہو جائے جو نشو و ارتقا کی فطری منازل طے کرنے کے بعد اب ابنائے نسلِ انسانی کی جائز وراثت ہیں۔ ہر ترقّی کا دَور ایک انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا

ہے اور انقلاب کا زمانہ اُن لوگوں کے لئے بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے جو امتدادِ زمانہ کے باعث پرانے رواجوں کے غلام ہوجاتے ہیں اور جن کے دل میں اتنی وسعت اور جسم میں اتنی ہمّت نہیں ہوتی کہ اپنی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال سکیں اور مجلسی تغیّرات کا اثر قبول کرسکیں۔ وہ لوگ جنہیں ترقی کے وسائل اور برتری کے اسباب حاصل کرنے کی مقدرت میسّر نہیں اپنے رشک اور حسد کو مذہبی عصبیّت اور قومی امتیاز کے پردوں میں چھپاتے ہیں اور جس چیز کو حاصل کرنے کی وہ خود صلاحیّت نہیں رکھتے اُسے مذموم سمجھ کر اور مردُود کہہ کر اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دے لیتے ہیں۔ اگر ایسے فرسودہ خیال لوگوں کی آرزو پوری ہوجایا کرتی تو نوعِ انسانی ہر دورِ انقلاب کی برکتوں سے محروم رہا کرتی اور انسان کا معاشری نظام آج بھی ویسا ہی ہوتا جیسا آغازِ آفرینش کے وقت تھا۔

آج مجھے اِس بات کا احساس ہے کہ اس مکتب کو ایک ماڈرن اسکول بنانے کی کوشش میری نوعمری کی جُرأت تھی۔ اور ناتجربہ کاری کا اعتماد۔ وہ سرزمین اُس بیج کے لئے موزوں ہی نہ تھی جو میں اُس میں بونا چاہتا تھا۔ اور وہ ماحول ابھی اُس

انقلاب کے لئے تیار نہ ہوا تھا جس کا خواب میں دیکھ رہا تھا۔ روز روز کی ناکامیوں سے میری ہمّت گھٹتی اور میری اُمنگ گھٹتی چلی جا رہی تھی۔

اِس عالم مایوسی میں مجھے اِس بات کا بڑی شدّت سے احساس ہوا کہ ہر شخص قوموں کا رہنما اور انقلاب کا مسبّب نہیں ہو سکتا۔ میں نے علی گڑھ میں سر سیّد کی اُن غیر فانی کوششوں کا مطالعہ بڑے غور و خوض سے کیا تھا جن کا مادی نتیجہ "علی گڑھ کالج" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ایک مجھ ہی پر کیا حصر ہے، علی گڑھ کالج کے وہ طلبہ جو ایسے علاقوں سے آئے تھے جو تعلیم کے لحاظ سے پس ماندہ اور تمدّن کے اعتبار سے درماندہ تھے۔ اپنے اپنے علاقوں کا سیّد احمد خاں بننے کی آرزو رکھنے لگے تھے اور ہمارے شب و روز کے مذاکرات میں یہی مشورے ہوا کرتے تھے کہ تعلیم سے فارغ ہو کر ہم اپنے اپنے وطن میں اگر علی گڑھ کالج کے پیمانے کی درس گاہ قائم نہ بھی کر سکیں تو کم از کم اس نمونے کا ایک مدرسہ ضرور جاری کر دیں۔ یہی عزمِ صمیم حقیقت میں میری اس جدّوجہد کا باعث اور محرّک تھا جو فریدیہ اسکول کے قیام کے سلسلے میں مجھ سے بر روئے کار

آئی - بڑے بڑے مقاصد پیشِ نظر رکھ کر دل کو نئی نئی آرزوؤں سے گرماتے رہنا اور چیز ہے۔ لیکن اِن آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور چیز ہے۔ بڑے بڑے مقاصد کے لئے جدّ وجہد بھی ہو سکتی ہے مگر اِس جدّ وجہد کی عملی تشکیل ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسا تغیّر اور انقلاب جو قوموں کو پستی کی گہرائیوں سے نکال کر برتری کی طرف لے جائے اور اُن کے عہدِ اِدبار کو دَورِ اقبال میں تبدیل کر دے۔ سب کے نزدیک ایک مستحسن چیز ہے۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو اُن طاقتوں سے متصادم ہونے کی قدرت رکھتے ہیں جو ہر دَورِ انقلاب میں قدم قدم پر سدِّ راہ بن جایا کرتی ہیں۔ اور اُن مخالفتوں سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں جو مختلف شکلوں میں ایسی کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے دن رات رُو نما ہوتی رہتی ہیں۔ اِس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ سر سیّد کو مسلمانوں نے کافر کہا۔ نیچری کہا۔ اسلام کا مخالف اور مسلمانوں کا دشمن کہا۔ مگر وہ بات کا دھنی اپنے ارادے پر قائم رہا۔ اور آخر کار اُس نے اپنی آنکھوں سے اس آئیڈیل کی زندہ تصویر دیکھ لی جس پر اُس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ میں سیّد احمد خاں بننا

چاہتا تھا۔ مگر یہ نہ جانتا تھا کہ جس آب و گل سے سیّد احمد خاں تعمیر ہوتے ہیں اُس سے ہر انسان کا خمیر نہیں اٹھایا جاتا۔ اور قوموں کے مُصلح اور ملّتوں کے رہنما بننے کے لئے جس صداقت، جس بے غرضی، جس خود فراموشی، جس شدّتِ ایثار اور صمیمیت عزم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہر مٹّی کے کھلونے کو میّسر نہیں۔ کہنے کو تو ہر زباں ور قلندر اپنے آپ کو قوموں کا مصلح اور ملّتوں کا رہنما کہتا ہے اور سمجھنے کو تو ہر مدّعی یہی سمجھتا ہے کہ گرمیٔ محفل اُسی کے دم سے ہے مگر

آتش آں نیست کہ بر شعلۂ اُو خندد شمع
آتش آنست کہ در خرمنِ پروانہ زدند

بہر حال کسی قطعی اِقدام سے پہلے میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے فیصلے کو اُس عظیم الشان انسان کی رائے سے مضبوط اور مستحکم کروں جس کی فطرتِ حق شناس کی تجلّی زندگی کی کئی مشکل راہوں میں میری شمعِ ہدایت بن چکی تھی اور جو اسی فطری سعادت کے باعث بعد میں حکیم اُلامّت کے عالی قدر لقب سے مشہور ہوا۔ لاہور آکر میں نے پاکپٹن شریف کے مسلمانوں کی یہ نفسیاتی کیفیّت اور اپنے اِن احساسات کی

روئداد سر محمد اقبالؒ کو سنائی۔ وہ پہلے تو حسبِ عادت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ جب میں اپنی کہانی سُنا چکا۔ تو فرمایا "جب میں تمہاری طرح جوان تھا۔ تو میرے قلب کی کیفیّت بھی ایسی ہی تھی۔ میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو انقلاب! ایک ایسا اِنقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذّب اور متمدّن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی ہے۔ اِن مکتبوں کو اِسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچّوں کو اِنہیں مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مُلّا اور یہ درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا۔ جو کچھ ہو گا میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان اِن مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اُسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور بابُ الاخوین کے سوا اسلام کے پیرووں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرے کے

تاج محل اور دلّی کے لال قلعے کے سِوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور اُن کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔" پھر اِس مُفکّرِ اعظم کی آنکھیں جواب آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ فضا کی وُسعتوں میں کچھ دیکھنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہیں۔ ہمیں نظر نہیں آتا۔ پھر اُسی طرح فضا میں نظریں گاڑے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی لے میں جو اُن کے آنسوؤں کے رُکے ہوئے طوفان کو اپنے اندر جذب کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ یہ اشعار پڑھنے لگے۔

کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے مِلّت مٹا رہے ہیں
غضب ہیں یہ رہبرانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
مُسافرانِ رہِ حرم کو رہِ کلیسا دکھا رہے ہیں

اُس مردِ کامل کے جذب اور شِدّتِ احساس کی اُس وقت یہ کیفیت تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں اپنی ذمّے داری کے احساس سے کانپ اُٹھا۔ میری یہ کیفیّت دیکھی۔ تو فرمانے لگے "تمہاری فطرت میں ایک جوہر ہے جو ابھی تربیت کا محتاج ہے۔ تمہارے جوش کی شراب ابھی ناپختہ

ہے۔ اِسے ذرا سی دیر اور خُم میں رہنے دو۔ کچھ دن میرے پاس آ کر رہو۔ میں تمہیں اُن باتوں کو بھلا دینا سکھا دوں گا جو تم نے کتابوں میں پڑھی ہیں۔ میں مدّت سے ایک دیوانے کی تلاش میں ہوں۔ شاید تمہارا جنُوں میری فطرت کی رمُوز سے آگاہ ہو جاتے" میں نے یہ محبّت بھرے الفاظ سنے۔ تو سمجھ گیا۔ اقبال کا دل آج بھی میرے لئے اُسی طرح شفقت سے لبریز ہے جس طرح پندرہ برس پہلے تھا۔

اب میں حیران تھا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ ایک طرف فریدیہؔ اسکول کو جو میرے برسوں کے تخیّل کا ایک مادی پیکر تھا علی گڑھ کالج کی سی اسلامی درسگاہ بنانے کی آرزو کی کشش تھی اور دوسری طرف اُس بادہ فروشِ جنوں کی صُحبت کی کشش تھی جس نے میری دیوانگی کو دعوتِ وحشت دی تھی اور جو لاہور کے ایک گمنام اور تنگ و تار گوشے میں بیٹھا اپنی فوقُ العادت ہمّت کے لئے اِن الفاظ میں ایک نیا دستورالعمل تجویز کر رہا تھا۔

در دشتِ جنُونِ من جبریلؑ زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ

مگر خیالات کے اِس ہیجان و تردّد میں یہ حقیقت واضح ہو

گئی کہ فریدیہ مکتب کو ایک ماڈرن اسکول بنانا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناموزوں اور نامناسب بھی ہے۔ میں پاکپتن شریف واپس گیا اور اب دن رات اسی فکر میں رہنے لگا۔ کہ فریدیہ اسکول کو جس کی داغ بیل میں نے اپنے ہاتھوں سے ڈالی تھی از سرِ نو وہی پرانا مکتب کیسے بنا دوں۔ اُس وقت میرے احساسات کی کیفیت ایسی تھی جیسی اُس شخص کے احساسات کی ہو جو اپنی ہی تعمیر کی تخریب کے درپے ہو جائے اور اُس عمارت کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانے لگے جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو۔ بہر حال یہ کام بھی کرنے کا تھا اور میں اسے ایسے طریق پر کرنا چاہتا تھا کہ نہ تو ناکامی میری زبوں ہمتی پر ہنسے اور نہ لوگوں کی نظر ہی میں میرا عزم رُسوا اور میرا نصب العین بدنام ہو جائے۔

اِس فکر کے ساتھ ساتھ اُس زمانے میں ایک اور فکر بھی میرے رُوحانی سکون و اطمینان میں خلجان پیدا کر رہی تھی آستانۂ مبارک کے ماحول اور وہاں کے زائرین کے افکار و امیال سے میں اِس قدر متاثر ہو چلا تھا کہ میرے دل میں یہ آرزو رہ رہ کر پیدا ہوتی تھی کہ میں بھی کسی ولیِ کامل اور مردِ خدا کے دستِ حق نما پر بیعت کر لوں۔ حضرت پیر مہر علیؒ شاہ اور حضرت میاں محمد خانؒ اُس وقت

اُن مردانِ کامل میں سے تھے جو آستانۂ مبارک پر اکثر حاضر رہتے تھے۔ اُن کی نظر مطلع انوار تھی اور ان کا سینہ مخزنِ اسرار۔ مجھے اِن دونو بزرگوں کی خدمت میں بڑی عقیدت تھی۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ مَیں نے اِن دونو اولیاء کرام کی ظاہری توجّہ اور باطنی تصرّف سے ایسا فیض پایا تھا کہ میرا قلب غیر ارادی طور پر کبھی حضرت پیر مہر علیؒ شاہ کی طرف کھنچنے لگ جاتا، کبھی حضرت میاں محمّد خانؒ کی طرف فریدیہؒ اسکول کے متعلق عالمِ ظاہر کا مطالبہ اور بیعت کے متعلق عالمِ باطن کا مطالبہ ایک ایسی کشمکش تھی جس نے میرے قویٰ کے انتہائی امکانات کا بڑی شدّت سے امتحان کیا۔ مَیں سارا سارا دن بے چین رہتا تھا اور رات کو بھی بہت کم سو سکتا تھا۔ ایک رات نصف شب کے بعد ذرا آنکھ جھپک گئی۔ تو مَیں نے خواب میں دیکھا کہ مَیں لاہور میں اپنے مکان کے دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوں۔ ناگہاں ایک وکٹوریہ گاڑی جس میں چار بلند قامت گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ میرے سامنے آکر رُک گئی۔ مَیں نے دیکھا کہ اُس میں میرے بچپن کے پیر و مرشد حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ تشریف رکھتے ہیں اُنہیں دیکھ کر مَیں بڑے شوق اور اضطراب سے آگے بڑھا۔

اور اُن کے قدم چُومے۔ اُنھوں نے اپنا دستِ مبارک میری طرف بڑھایا۔ میں نے حضرتؒ کے دستِ مبارک کو اپنے دونو ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا۔ حضرتؒ نے ایک ایسی نظر سے کہ کہ مہبطِ انوارِ جلال وجمال تھی، میری طرف دیکھا اور فرمایا "احمدؒ! محمود سے پُوچھو"۔ اِس آواز کی صَولت و عظمت کے احساس سے میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے وضُو کیا اور صبح تک دُرود شریف پڑھتا رہا۔ جب دیوان صاحب فجر کی نماز کے بعد آستانۂ مبارک کے حجُرے سے برآمد ہوئے۔ تو میں نے اُن کی خدمت میں اِس خواب کا ماجرا بیان کیا۔ اُنھوں نے مسکرا کر فرمایا "تمہارے پیر و مُرشد حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ کے صاحبزادے خواجہ محمود صاحب پاکپتن شریف آئے ہوئے ہیں اور قطبؒ صاحب کے حجُرے میں مقیم ہیں۔ اِس خواب کی تعبیر اُنہیں سے پوچھو۔ غالباً حضرت کا اشارہ اُن کی طرف تھا"۔ دس بجے کے قریب میں خواجہ محمود صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور اُن کو اپنا خواب سنایا۔ میرے خواب کی رُوئداد سُن کر اُن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ زبانِ مبارک پر دُرود شریف جاری تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور قلب کا اِضطراب

اُن کے چہرے کے رنگ کے متواتر اور مسلسل تغیّر سے عیاں تھا۔ اُٹھ کر آگے بڑھے، مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور بہت دیر تک اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ پھر فرمانے لگے "تم پر تمہارے پیر کا بڑا کرم ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم اُنہیں کے مُرید رہو" پھر پوچھنے لگے "کیا تم نے کسی کی بیعت کا ارادہ تو نہیں کیا" مَیں نے اپنے قلب کی واردات کہہ سنائی۔ اور اُس ہیجانِ فکر کا ذکر کیا۔ جس میں اُن دِنوں مَیں مبتلا تھا۔ حضرت نے فرمایا۔ "اب اپنے خواب کی تعبیر سُنو۔ تمہارے والد حضرت کے مرید تھے۔ تم حضرتؒ ہی کی دُعا سے پیدا ہوئے تھے۔ اور تمہارا نام احمدؐ بھی حضرتؒ ہی نے رکھا تھا۔ حضرتؒ کو احمدؐ اور محمُود دونوں ناموں سے بڑی محبّت تھی۔ جب تم کوئی ایک برس کے تھے۔ تو حضرتؒ لاہور تشریف لائے اور تمہارے والد کے مکان ہی پر ٹھہرے۔ اُس وقت مَیں اُن کے ہمراہ تھا۔ تمہارے والد نے تمہیں اُن کے قدموں میں ڈال کر ایک دن عرض کی "غلام زادے کو بھی بیعت سے مشرف فرما دیجئے" حضرتؒ نے تمہارے ننّھے ننّھے ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لئے۔ اور فرمایا "آج سے یہ میرا مرید ہے" اُس وقت اُن کے حضور صرف تمہارے والد، مَیں اور

تم حاضر تھے۔ مَیں تمہاری بیعت کا گواہ ہوں۔ حضرتؒ نے خواب میں تمہیں اشارہ فرمایا ہے کہ تم اُن کے مرید ہو اور تمہیں ہدایت کی ہے کہ اپنی بیعت کا احوال مجھ سے پوچھ لو۔ اب تم کبھی بھولے سے بھی کسی کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنا۔ حضرتؒ کے اَوراد مجھ سے لے جاؤ۔ انہیں کو اپنا وظیفہ بناؤ۔ اور حضرتؒ ہی کو اپنا پیر و مرشد سمجھو"۔ مَیں نے اپنے پیر و مرشد کے نورِ نظر کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے بچپن کی بیعت پر مستحکم ہو گیا۔

آئندہ زمانے میں حضرتؒ کی روحانی رہنمائی سے جو جو شادمانیاں مجھے میسّر آئیں اور جن جن مشکلات سے مَیں نے نجات پائی۔ اُن کا ذکر آگے آئے گا۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ اُسی وقت سے میرا اضطراب و کرب جاتا رہا اور میری طبیعت کو وہ سکون حاصل ہو گیا جو کسی طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر چھا جاتا ہے۔ بعد میں اِس خواب کی کیفیّت مَیں نے حضرت پیر مہرؒ علی شاہ اور حضرت میاں محمد خانؒ کی خدمت میں عرض کی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور حضرت خواجہ محمودؒ صاحب کی تعبیر کی تصدیق فرمائی۔ جب تک یہ دونو بزرگؒ اِس دارِ فانی میں اپنی حیاتِ جاودانی کی منزلیں طے کرتے رہے، مجھ پر ہمیشہ بیش از پیش کرم فرماتے

رہے ۔ خوابوں کی صداقت اور عالمِ رویا کی حقیقت کے متعلق میرے مشاہدات کچھ ایسے عجیب و غریب ہیں۔ کہ اُن کا ذکر کسی قدر طوالت چاہتا ہے۔ بہر حال ان کا بیان آگے چل کر کسی مناسب مقام پر ہوگا۔

اب فریدیہؒ اسکول رفتہ رفتہ پھر وہی پرانا مکتب بن گیا۔ اور میں اُس کا انتظام ایک فارغ التحصیل درویش کے سپُرد کر کے اُس کوشش و کاوش سے دست بردار ہو گیا جو دس مہینے تک میری زندگی کی ایک ہی مصروفیت تھی۔ ایک کشش جاتی رہی تو دوسری کشش نے کھینچنا شروع کیا۔ اور اقبالؒ کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے "میں مدّت سے ایک دیوانے کی تلاش میں ہوں۔ شاید تمہارا جنون میری فطرت کی رموز سے آگاہ ہو جائے"

زندگی کا یہ دَور یہاں ختم ہوتا ہے۔ فلسفے کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا۔ فلسفیوں کی زبان ہی سے اُس کی تکذیب سُن لی۔ واعظوں کے وعظ میں جو کچھ سنا تھا۔ اُنہیں کے ہاتھوں اُس کی تخریب دیکھ لی۔ میں تہذیب کی ریاکاری اور تمدّن کی ناشائستگی سے گھبرا کر سکونِ قلب کی تلاش میں آیا تھا مگر خود ساختہ مقاصد اور مسلّمہ نظریات کی خلش نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ آخر کار میں پھر اُسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھا

اور اُن زخموں کے اندمال کی تدبیریں سوچنے لگا جن سے عزم کی چھاتی چھلنی اور ہمّت کی کمر چوُر ہو گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس گوشۂ عافیت میں سکون و اطمینان موجود تھا۔ مگر اس سکون سے زندگی اپنے افعال سے عاری ہو چلی تھی اور حواس اپنی کارگزاری سے معطّل ہو رہے تھے۔ اب دل نے فیصلہ کیا کہ کچھ دن اقبال کے قدموں میں بیٹھ کر اُس دشتِ جنوں میں آوارہ ہو جاؤں جس کی وسعت اُس زمانے میں بھی مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اُس دیوانے کے علم و عرفان کے چشمۂ حیات سے پیاس بجھاؤں جس کی ایک ہُو نے مجھے غمِ دوش اور اندیشۂ فردا سے آزاد کر دیا تھا۔

کشیدہ ام زجنوں ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیرِ مے فروش نماند

عبدالحمید خاں پرنٹر و پبلشر نے فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر فیروز سنز ۶۰ سرکلر روڈ لاہور سے شائع کی

بہائے خونِ دل سادہ این دو سہ ورق است

چہ رنجہا کہ بہ این کار سالہا خوردم

ازاں کہ جنسِ فرومایہ در خورِ نظر است

بہارِ این زرِ نایاب را فرو بُردم